قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1964 — کنونشن نمبر — جنوری 1965

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

Rs. 2/-

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام لاہور

کنونشن نمبر

بدلِ اشتراک
پاکستان و ہند سے
سالانہ - دس روپے
غیر ممالک سے
سالانہ - ایک پونڈ

ٹیلیفون نمبر (۸۰۸۰۰)
خط و کتابت کا پتہ
ناظمِ ادارہ
طلوعِ اسلام
۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

جلد ۱۷ و ۱۸ | دسمبر ۱۹۶۴ء | اس پرچہ کی قیمت دو روپے | جنوری ۱۹۶۵ء | شمارہ نمبر ۱۲ و ۱

فہرستِ مضامین

لمعات		۲
روئیدادِ کنونشن		۵
رپورٹ ناظمِ ادارہ		۳۸
استقبالیہ	(میرزا محمد خلیل صاحب)	۴۹
بقیہ لمعات		۵۳
جمہوریت	(ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب)	۵۵
حرفِ دل نواز	(محترم پرویز صاحب)	۶۵
مذاکرہ	(۱۳۷-۸۹)	
تحریکِ طلوعِ اسلام کا پس منظر	(خالد اسلام)	۹۱
فکر و جذبات	(منیر مظفر)	۹۸
فضا سازگار نہیں	(زاہدہ منظور)	۱۰۳
ذمہ داری سے فرار	(جاوید رحیم)	۱۰۹
معاشی موانعات	(ڈاکٹر رشیدہ)	۱۱۵
اقتباسِ نوٹس	(شمیم انور)	۱۱۷
راستے کے کانٹے		۱۲۰
کشمکش	(سلمیٰ پرویز)	۱۲۹
مخالفت	(نجمہ)	۱۳۱
رابطۂ باہمی — بزمِ کراچی		۱۳۳
پھاٹک کھل گیا		۱۳۴
سماجی برائیاں	(ڈاکٹر صلاح الدین اکبر)	۱۴۴
تحریکِ طلوعِ اسلام کا پس منظر	(حسن عباس رضوی)	۱۵۰

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام لاہور

کنونشن نمبر

بدلِ اشتراک
پاکستان و ہند سے
سالانہ - دس روپے
غیر ممالک سے
سالانہ - ایک پونڈ

ٹیلیفون نمبر (۸۰۸۰۰)
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ
طلوعِ اسلام
۲۵/بی - گلبرگ - لاہور

جلد ۱۷ و ۱۸ | دسمبر ۱۹۶۴ء | اس پرچہ کی قیمت دو روپے | جنوری ۱۹۶۵ء | شمارہ نمبر ۱۲ و ۱

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
لمعات		۲
روئیداد کنونشن		۹
رپورٹ ناظم ادارہ		۳۸
استقبالیہ	(میرزا محمد خلیل صاحب)	۴۹
بقیہ لمعات		۵۳
جمہوریت	(ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب)	۵۵
حرفِ دلنواز	(محترم پرویز صاحب)	۶۵
مذاکرہ (۸۹-۱۲۷)		
تحریک طلوعِ اسلام کا پس منظر	(خالد اسلام)	۹۱
فکر و جذبات	(منیر غضنفر)	۹۸
فضا سازگار نہیں	(زاہدہ منظور)	۱۰۳
ذمہ داری سے فرار	(جاوید رحیم)	۱۰۹
معاشی موانعات	(ڈاکٹر رشیدہ)	۱۱۵
احتسابِ خویش	(شمیم انور)	۱۱۷
راستے کے کانٹے		۱۲۰
کشمکش	(سلمیٰ پرویز)	۱۲۹
مخالفت	(نجمہ)	۱۳۱
رابطۂ باہمی — بزم کراچی		۱۳۳
پھاٹک کھل گیا		۱۳۴
سماجی برائیاں	(ڈاکٹر صلاح الدین اکبر)	۱۴۴
تحریک طلوعِ اسلام کا پس منظر	(حسن عباس رضوی)	۱۵۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

راہ بیں ——— یا ——— راہزن؟

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں ہم نے، صدر کے انتخاب کے سلسلہ میں، "جذبات یا عقل" کے عنوان سے جو کچھ لکھا تھا، ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ملک کے سنجیدہ طبقہ نے اسے درخورِ غور و فکر سمجھا اور بہ نگہ استحسان دیکھا۔ اکثر گوشوں سے یہ تجویز بھی موصول ہوئی کہ اسے پمفلٹ کی شکل میں ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا جائے اور بنیادی جمہوریت کے جدید منتخب شدہ اراکین تک پہنچایا جائے تاکہ وہ صدر کے انتخاب کے وقت 'سطحی جذبات میں بہ جانے کے بجائے' غور و فکر سے کام لے کر فیصلہ کریں۔ زیرِ نظر لمعات بھی اُسی سلسلہ کی اگلی کڑی ہیں۔ ان کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ قوم کے نازک ترین جذبات کو مشتعل کر کے، ایسے اہم مسئلہ کو جس پر ملک کے مستقبل کا دارومدار ہے، بگولوں کی نذر کیا جا رہا ہے۔

اس حقیقت کو ہم پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ طلوعِ اسلام کو شخصیتوں سے نہ کبھی تعلق رہا ہے نہ تعلق رہے گا۔ قرآن کا اولین پیغام یہ ہے کہ شخصیتوں سے بلند ہو کر اصول کو سامنے رکھا جائے۔ طلوعِ اسلام نے تحریکِ پاکستان کا اس قدر عزم و استقامت اور دل جمعی اور یک جہتی سے ساتھ دیا تو اس لئے نہیں کہ اس تحریک کی علمبردار، محمد علی جناح جیسی شخصیت تھی۔ اس نے اس لئے ساتھ دیا تھا کہ جس مقصد کے حصول کے لئے اس تحریک کو سامنے لایا گیا تھا وہ قرآن کریم کے منشاء کے مطابق اور اسلام کو بہ حیثیت ایک نظامِ اجتماعی متشکل کرنے کا قدمِ اولین تھا ——— اور اگر ہم آج چاہتے ہیں کہ صدارت کا منصب ایک بار پھر محمد ایوب خان کے پاس رہے،

تو اس لئے نہیں کہ ہم محترم موصوف کی شخصیت سے مرعوب ہیں اور آنے والے انتخاب میں ان کے وکیل - بلکہ اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ قرآنی نظام کی تشکیل کے لئے پاکستان کے خطۂ زمین کا تحفظ نہایت ضروری ہے اور بہ حالات موجودہ، یہ فریضہ، محترم موصوف کے ہاتھوں سرانجام پا سکتا ہے - اس کے برعکس ہمیں خدشہ ہے ـــــ اور علیٰ وجہ البصیرت خدشہ، کہ اگر زمامِ اقتدار حزبِ مخالف کے ہاتھ میں چلی گئی تو شاید یہ خطۂ زمین ہی (خاکم بدہن) ہمارے ہاتھ سے چلا جائے - ہندوستان میں "اکھنڈ بھارت" کی تحریک (یعنی پاکستان کو ہندوستان کے ساتھ بارِ دیگر ملا لینے کی تحریک) یوں تو تقسیم ہند کے زمانے ہی سے ...... سلگتی چلی آ رہی تھی لیکن آج کل اسے خاص طور پر ہوا دی جا رہی ہے - اس تحریک کے علمبردار، محترمہ مس فاطمہ جناح کی صدارت کی بڑی شد و مد سے تائید کر رہے ہیں - جس کا جی چاہے وہاں کے اخبارات اٹھا کر دیکھ لے - دوسری طرف، حزبِ مخالفت میں بیشتر وہ لوگ شامل ہیں جو ہندوستان میں بھی تحریک پاکستان کے مخالف تھے، اور اب تک بھی وہ دل سے اس تقسیم کو اپنا نہیں سکے - ان لوگوں کے، اکھنڈ بھارت تحریک کے حامیوں کے ساتھ ذہنی روابط ہیں - اور وہ لوگ، خان عبدالغفار خان جیسے پاکستانی تحریک کے مخالفوں کی ابھی تک اسی طرح عزت کرتے اور بار بار ان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھ رہے ہیں - اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں آ گیا تو پارلیمان کا ایک ریزولیشن اور کابینہ کی طرف سے اس کی تصویب، پاکستان کے وجود کو عملاً ختم کر دینے کے لئے کافی ہو گی - ان لوگوں نے تو یہاں تک مشہور کرنا شروع کر دیا ہے کہ خود محترمہ مس فاطمہ جناح تقسیم ہند کے خلاف تھیں - چنانچہ بجنور سے شائع ہونے والے نیشنلسٹ اخبار 'مدینہ' کی یکم اکتوبر ۱۹۶۴ء کی اشاعت کے پہلے صفحہ پر جلی سرخی کے ساتھ حسب ذیل خبر شائع ہے -

> نئی دہلی - ۲۷ ستمبر - یہاں پاکستان میں ہندوستان کے سابق ہائی کمشنر مسٹر سری پرکاش نے انکشاف کیا ہے کہ ۱۹۴۹ء میں مس فاطمہ جناح نے ان سے خواہش کی تھی کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی بھرپور کوشش کریں -
>
> ہندوستان کے بزرگ سیاستداں اور مدبر مسٹر سری پرکاش نے یہاں کے اخبار "ہندوستان ٹائمز" میں اپنی ہائی کمشنری کے آخری دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سبکدوشی سے پہلے میں نے جو رخصتی ملاقاتیں کیں ان میں مس فاطمہ جناح بھی شامل تھیں - ان کے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا، وہ ایک نئے مکان میں یکہ و تنہا خلوت کی ایسی زندگی بسر کر رہی تھیں جس میں ان تمام لوگوں نے ان کو الگ چھوڑ دیا تھا اور فراموش کر دیا تھا جو ان کے بھائی کے ساختہ پرداختہ تھے - وہ ابھی تک گہرا سیاہ ماتمی

لباس پہنے ہوئے تھیں - انہوں نے مہربانی سے میرا خیر مقدم کیا، اور کہا "مجھے نہیں معلوم کہ قائدِ اعظم نے یہ کیوں سمجھا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ نہیں رہ سکتے - بہرحال انہوں نے یہی سمجھا تھا - براہ کرم آپ اپنے تمام اثرات ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لئے استعمال کیجئے"

مسٹر سری پرکاش نے لکھا ہے کہ مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی - اول تو میرے کوئی اثرات نہیں تھے - اور اس کے علاوہ اپنے پورے ارادے اور خواہش کے باوجود میں کیا کر سکتا تھا؟

ان کی تنہائی اور ہماری مشترکہ مادرِ وطن کی المناک تقسیم کے نتیجے میں اپنے ملک اپنے عوام، پاکستان اور مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا - اس سب پر میں مس فاطمہ جناح سے غم زدہ رخصت ہوا۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ خبر کہاں تک مبنی بر صداقت ہے ---- اور ہمارا دل نہیں مانتا کہ یہ خبر صحیح ہوگی ---- لیکن ایک طرف یہ حقیقت ہے کہ مسٹر سری پرکاش نے اس خبر کو پندرہ برس تک چھپائے رکھنے کے بعد، پہلی مرتبہ اس وقت ہوا دی ہے جب محترمہ مس فاطمہ جناح انتخاب لڑنے کے لئے میدانِ سیاست میں آئی ہیں - اور دوسری طرف یہ حقیقت کہ یہ خبر ہندوستان کے مشہور اخبار (ہندوستان ٹائمز) میں شائع ہوئی - اور وہاں سے اس ملک کے دیگر جرائد نے نقل کیا - اور اس کے باوجود محترمہ مس فاطمہ جناح کی طرف سے اس کی تردید نہیں ہوئی - (کم از کم ان سطور کی تحریر کے وقت تک ایسی کوئی تردید ہماری نگاہوں سے نہیں گزری)، ہندوستان کے ہندوؤں کے لئے اس امر کی اچھی دلیل بن سکتی ہے کہ عوامی لیگ، نیشنل عوامی پارٹی، سرخپوش اور جماعت اسلامی جیسی نظریۂ پاکستان کی مخالف پارٹیوں نے محترمہ مس جناح کو اپنا سربراہ کیوں چنا ہے اور محترمہ موصوفہ نے ان کی رفاقت و تائید کیوں قبول کی ہے ---- ایک چیز روزِ روشن کی طرح واضح ہے - اور وہ یہ کہ پاکستانی سیاست کے سلسلہ میں ہندوستان کا ہندو جس اقدام کی تائید کرے ---- بالخصوص اکھنڈ بھارت کا مؤید سنگھی ہندو ---- وہ چیز پاکستان کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتی۔ سوچئے کہ جب وہاں کے ہندو بیک زبان محترمہ مس فاطمہ جناح کی صدارت کی تائید کر رہے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہے - اگر متحدہ محاذ اپنی کوششوں میں (خدا نکردہ) کامیاب ہو گیا تو (ہندوستان کے ہندوؤں کا موجودہ طرزِ عمل اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ) اس سے ان کے گھروں میں گھی کے چراغ جلیں گے اور جشنِ مسرت کے شادیانے بجیں گے - قرآن کریم نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ يَّفۡرَحُوۡا بِهَا ‎(۳/۱۱۹)‏ - جو بات تمہارے فائدے کی ہوتی ہے اس سے ان کے گھروں میں صفِ ماتم

بچھ جاتی ہے۔ اور جو بات تمہارے لئے تخریب کا موجب ہوتی ہے اس پر وہ جشنِ مسرت مناتے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جب ہندوستان کا ہندو بیک زبان محترمہ مس فاطمہ جناح کی صدارت کی تائید کر رہا ہے تو یہ چیز پاکستان کے لئے موجبِ خیر و برکت ہوگی یا باعثِ تخریب و مضرت۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ ہر چیز کو عقل و بصیرت کی رُو سے پرکھو اور (ON MERIT) اس کا فیصلہ کرو۔ اس کے برعکس، وہ ایک اور گروہ کا ذکر کرتا ہے جو پیش نظر شے کی اصل و حقیقت پر غور کرنے کے بجائے اسے ایک مقدس اور عظیم سا نام دیدیتے ہیں اور پھر اس نام کی عظمت کے سہارے اُس کو عوام کی نگاہوں میں مقدس بنا کر اس کا احترام و عقیدت ان کے دلوں میں جاگزیں کر دیتے ہیں۔ گائے ایک عام حیوان ہے۔ لیکن ہندو دھرم کے سوامیوں نے اسے "ماتا" کہہ کر عوام کی نگاہوں میں اسے احترام و عقیدت کا پیکر بنا دیا۔ اسی طرح بھارت ایک ملک ہے۔ لیکن وہاں کے سیاسی نیتاؤں نے اسے "ماتا" کہہ کر عوام کی نظروں میں اسے سچ مچ کی ماں بنا دیا۔ آپ کو یاد ہے کہ تقسیمِ ہند کے خلاف وہاں کے سیاسی لیڈر عوام کو یہ کہہ کر بھڑکایا کرتے تھے کہ اس سے مسلمان تمہاری ماتا کو کاٹ کر دو ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مسٹر گاندھی کو "مہاتما" کا نام دے کر، اسے سیاست کے میدان سے نکال کر اوتاروں کی صف میں کھڑا کر دیا تاکہ اسے تنقید کی حد سے ماورا تسلیم کر لیا جائے۔ جذبات پرستوں کی یہی وہ ٹیکنیک ہے جسے قرآن نے یہ کہہ کر واضح کیا ہے کہ جن چیزوں کو یہ اس قدر مقدس اور باعظمت بنا کر پیش کرتے ہیں وہ اس کے سوا کیا ہیں کہ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوهَا اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ (۵۳/۲۳)۔ چند نام ہیں جو انہوں نے یا ان کے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں۔ ان ناموں کی تقدیس کو ان چیزوں سے الگ کر دو۔ یہ اپنی اصلی شکل میں سامنے آجائیں گی۔ اس کے بعد تم دیکھو کہ ان کا صحیح مقام کیا ہے۔ انہیں اسی مقام پر رکھو۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کس طرح جذباتی اپیلوں کے نگاہ فریب پردوں کو چاک کر کے، ہر شے کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھنے اور پیش کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن، بدقسمتی سے، ہم وہی کچھ کرتے ہیں جسے روکنے کی قرآن تلقین کرتا ہے۔ ہم بھی کسی شے کو اس کے (MERIT) کے لحاظ سے پرکھنے کی بجائے، اس کے ساتھ ایک مقدس نام چپکا دیتے ہیں اور اس طرح اسے تقدیس کے پردوں میں چھپا کر تنقید کی حد سے بالاتر کر دیتے ہیں۔ ہم صدیوں سے یہی کچھ کرتے چلے آرہے ہیں اور آج (صدارتی انتخاب کے سلسلہ میں) بھی یہی کچھ کر رہے ہیں۔ محترمہ مس فاطمہ جناح، صدارت کی امیدوار ہیں۔ ان کے مقابل میں ایک اور امیدوار ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ان دونوں امیدواروں کی خصوصیات کو عقل و خرد کی رو سے پرکھا جاتا اور اس منصب کے اہل ہونے یا نہ ہونے کا (MERIT) کے لحاظ سے فیصلہ کیا جاتا۔ لیکن ہم نے کیا کیا؟ ہم نے انہیں "مادرِ ملت" کا نام دے کر عوام کے جذبات سے یوں اپیل کرنا شروع کر دیا

کہ ایک طرف تمہاری ماں ہے اور دوسری طرف محمد ایوب خان۔ بتاؤ! ماں کا ساتھ دوگے یا ایک غیر مرد کا۔ اُس کے بعد، گلی گلی۔ محلے، محلے۔ پکارنا شروع کر دیا کہ

ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔

ماں کی اطاعت فرض ہے۔

جو ماں کو ووٹ نہیں دیتا وہ.........

سوچئے کہ اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیئے کہ دو امیدواروں میں سے، منصبِ صدارت کے لیئے زیادہ موزوں کون ہے، اس طرح کے سلوگن اور جذباتی تراش، کبھی بھی صحیح فیصلہ تک پہنچنے کا موجب بن سکتے ہیں؟ یہ حقیقت ہے کہ ایک سچے مسلمان کے نزدیک، (اپنی بیوی کے علاوہ) دنیا کی ہر لڑکی، بمنزلہ اپنی بیٹی کے، ہر برابر کی عورت بمنزلہ اپنی بہن کے۔ اور ہر بڑی عمر کی خاتون بمنزلہ اپنی والدہ کے ہوتی ہے۔ لیکن قرآن نے، اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ ان سے شفقت اور احترام بجا اور درست لیکن اس سے وہ ان حقوق و خصائص کی حامل نہیں ہو جاتیں جو حقیقی بیٹی۔ بہن یا ماں کا حصہ ہیں۔ نبی اکرمؐ نے حضرت زیدؓ کو منہ بولا بیٹا بنایا تو قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ آپؐ ان سے بیٹوں جیسی محبت ضرور کیجیئے لیکن اس سے وہ آپؐ کا حقیقی بیٹا نہیں بن سکتا۔ مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَکُمْ اَبْنَآءَکُمْ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاهِکُمْ (۳۳/۴)۔ منہ بولے بیٹے حقیقی بیٹے نہیں بن جایا کرتے۔ یہ محض تمہاری زبانی بات ہے (جو تم انہیں بیٹا کہہ کر پکارتے ہو) اسی طرح جب حضورؐ نے مدینہ آکر، مہاجرین اور انصار میں سلسلۂ مواخات قائم کیا تو قرآن نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ ان کے باہمی تعلقات یقیناً بھائیوں جیسے ہیں لیکن قانون کی رُو سے جو پوزیشن حقیقی بھائیوں کی ہے (مثلاً بھائی کی لڑکی سے رشتۂ مناکحت جائز نہیں) وہ پوزیشن ان کی نہیں ہو جائے گی (۳۳/۶)۔ لہٰذا، اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ جس خاتون کو ہم احتراماً ماں کہہ کر پکار دیں اس کی اطاعت بھی فرض ہو جائے گی۔

اور قرآن کی رُو سے تو یہ بھی صحیح نہیں کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ اطاعت صرف صحیح بات کی کی جائیگی۔ (اور صحیح سے مراد یہ ہے کہ وہ بات قرآنی معیار کے مطابق حق و انصاف کے خلاف نہ ہو)۔ اگر ماں باپ بھی غلط بات کا حکم دیں تو قرآن کہتا ہے کہ انکی بات بھی مت مانو (۲۹/۸)۔ ہندوؤں نے رام چندر جی کو اوتار مان لیا محض اس وجہ سے کہ انہوں نے یہ جانتے ہوئے کہ باپ غلط بات کا حکم دے رہا ہے، اس کی بات کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ لیکن قرآن کریم نے ہمارے سامنے رام کی نہیں، حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کو بطور اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے۔ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۶/۷۵)۔

جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ آپ کیا ان پتھر کی مورتیوں کو خدا بنائے ہوئے ہیں۔ تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ اور آپکی قوم کے لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ والدین کے ساتھ قرآن کریم نے حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر وہ بڑھاپے کی وجہ سے بہکی بہکی باتیں کرنے لگ جائیں تو فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ۔ انہیں ڈانٹا نہ کرو۔ وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۱۷/۲۳)۔ بلکہ ان سے نرمی سے بات کیا کرو۔ کیونکہ یہ عمر وہ ہے جس میں انسان کی عقل اوندھی ہو جاتی ہے (۳۶/۶۸) اور انسان جو باتیں اس سے پہلے اچھی طرح جانتا ہے، بڑھاپے میں وہ بھی بھول جاتی ہیں (۲۲/۵)۔ جس طرح محترمہ مس فاطمہ جناح اس حقیقت کو بھول گئی ہیں کہ جن لوگوں کے بل بوتے پر وہ میدانِ سیاست میں آئی ہیں یہ وہ ہیں جنہیں ان کا بھائی (قائد اعظمؒ) پاس تک بھی نہ پھٹکنے دیتا۔

یہ ہے وہ پوزیشن جو قرآن کریم حقیقی والدین کو عطا کرتا ہے، چہ جائیکہ یہ کہا جائے کہ ایک ایسی خاتون جسے احتراماً ماں کہہ دیا جائے اسے حق حاصل ہو جاتا ہے کہ اس کی ہر بات مانی جائے۔ حقیقی ماں کی صورت میں بھی اگر سوال پیشِ نظر یہ ہو کہ رات کو کیا پکے گا۔ یا بیٹی کو جہیز میں کیا دینا چاہیئے تو اس کے پاس خاطر سے اس کی بات مان لینے میں چنداں مضائقہ نہیں ہوگا۔ لیکن جب معاملہ ایسا اہم ہو کہ اس کے فیصلہ پر ملک اور قوم کے مستقبل کا دار و مدار ہو تو اس پر نہ والدہ کے جذبات کی رعایت کو اثر انداز ہونا چاہیئے نہ اس کی ناراضگی کے سوال کو درمیان میں حائل۔ اس وقت فیصلہ خالصتاً حقائق کی بنا پر ہونا چاہیئے۔

بات بالکل صاف ہے۔ ہمارے سامنے ملک کی صدارت کے لئے دو امیدوار ہیں۔ ہمیں، جذبات کو درمیان لائے بغیر، یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان دونوں میں سے ملک کا مستقبل کس کے ہاتھ میں محفوظ رہے گا۔ محترمہ مس فاطمہ جناح ملک میں پارلیمانی انداز حکومت کا احیاء چاہتی ہیں۔ پارلیمانی حکومت میں، صدر کے اختیارات محض رسمی سے ہوتے ہیں۔ اصل اقتدار اور اختیار وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کو حاصل ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ محترمہ موصوفہ کی کامیابی کی صورت میں، اقتدار اور اختیار ان لوگوں کو حاصل ہوگا جو اس وقت متحدہ حزبِ مخالف بنائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا، اصل سوال محترمہ مس فاطمہ جناح کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا ہے جو ان کے اس وقت رفیق کار ہیں — محترمہ موصوفہ کو عملی سیاست کا کوئی تجربہ ہی نہیں۔ نہ ہی ان کی کوئی اپنی پارٹی ہے نہ تنظیم۔ وہ اپنی موجودہ انتخابی جد و جہد کے لئے بھی انہی لوگوں کی کوششوں کی محتاج ہیں۔ اور صدر بننے کے بعد بھی انہی کی نگہِ کرم کی محتاج رہیں گی۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ جب زمامِ اقتدار، خان عبد الغفار خان۔ مولانا بھاشانی۔ شیخ مجیب الرحمٰن اور مودودی صاحب کے ہاتھ میں آئے گی تو اس ملک کا حشر کیا ہوگا؟ اول تو ان متضاد عناصر کی باہمی کشمکش سے اس زمامِ بیچاری ہی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، لیکن جب تک بھی یہ

سلامت رہی، یہ لوگ ملک کے خلاف کیا کچھ نہیں کر گزریں گے۔ خان عبدالغفار خان اُس وقت بھی تقسیمِ ملک کے خلاف تھے جب گاندھی اور نہرو تک اس پر راضی ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھری مجلس میں کانگریسی نیتاؤں سے کہہ دیا تھا کہ "کیا آپ ہمیں بھیڑیوں کے حوالے کر رہے ہیں"۔ انہوں نے ریفرینڈم کے لئے تجویز پیش کی تھی کہ اس میں پاکستان اور ہندوستان کے متعلق ہی استصواب نہ ہو بلکہ آزاد پختونستان کی تیسری شق بھی اس میں شامل کی جائے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد ان کی ساری جدوجہد کا محور پاکستان کی مخالفت اور پختونستان کی تخلیق رہا ہے۔ مولانا بھاشانی کی اشتراکی جدوجہد سے کون ناواقف ہے۔ مجیب الرحمٰن صاحب نے حال ہی میں کہا ہے کہ اگر ان کی پارٹی برسرِ اقتدار آگئی تو وہ ہندوستان سے مفاہمت کرکے، پاکستان کا فوجی بجٹ کم کریں گے۔ آپ غور کیجئے کہ ان لوگوں کے عزائم کیا ہیں — اور یہ کچھ ابھی اس زمانے میں کہا جا رہا ہے جب انتخابی مصلحتوں کے پیشِ نظر وہ کھل کر لب کشائی نہیں کر سکتے۔ مودودی صاحب، برسرِ اقتدار آنے کے بعد، پاکستان کے "پیدائشی مسلمانوں" کو ایک سال کا نوٹس دینے کی ٹھانے بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد، جو شخص ان کے عقائد و خیالات سے متفق نہیں ہوگا، اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اور اگر انہیں اس قسم کی "اسلامی حکومت" قائم نہیں کرنے دی جائے گی تو وہ اس مملکت کے گھر وندے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے۔ کیونکہ انہوں نے مدتوں پہلے سے اعلان کر رکھا ہے کہ اگر پاکستان میں ان کے تصور کے مطابق حکومت قائم نہیں ہوگی تو یہاں کی حکومت ہندوستان کی کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہوگی — ظاہر ہے کہ انہیں اس مملکت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جس میں حکومت کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہو۔

یہ تو ہیں ان کی منفیانہ خصوصیات۔ جہاں تک ان کی مثبت خوبیوں کا تعلق ہے اس کا اندازہ صرف اس ایک حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان سب میں کوئی ایک مرد بھی ایسا نہیں جسے خود یہ لوگ ملکی نظم و نسق سنبھالنے کا اہل سمجھیں۔ مودودی صاحب نے کہا ہے کہ اسلام میں عورت کا سربراہ مملکت ہونا عام حالات میں تو جائز نہیں لیکن جب اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو یہ جائز قرار پا سکتا ہے۔ اضطراری حالت کا قرآن کریم کی رو سے مطلب یہ ہے کہ اگر صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ کھانے کے لئے کوئی حلال شے نہ مل سکے تو جان بچانے کی خاطر حرام کھا لینا جائز ہوگا۔ ان کے اس فیصلے کا مطلب بالکل واضح ہے کہ ملک بھر میں ایک مرد بھی ایسا موجود نہیں جو صدارت کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کا اہل ہو۔ اس لئے عورت کو سربراہ منتخب کرنے کی تجویز کی گئی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جن پانچ پارٹیوں کی کیفیت یہ ہو کہ خود ان کے اپنے اعتراف کے مطابق، ان میں ایک آدمی بھی ایسا نہ ہو جسے وہ صدارت کا اہل سمجھیں، تو ان پارٹیوں کے اربابِ سیاست کی نااہلی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے! اور "نااہلی" بھی کس درجہ کی؟ مودودی صاحب نے موچی دروازہ لاہور کی تقریر میں

(بقیہ بر صفحہ ۵۳)

روئیداد

طلوعِ اسلام کنونشن

(آٹھواں سالانہ اجتماع)

۱۲-۱۳-۱۴-۱۵ نومبر ۱۹۶۴ء

پھر نظر میں پھول مہکے۔ دل میں پھر شمعیں جلیں

پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

طلوعِ اسلام کنونشن

نکہت فشاں ہوئی ہے گلستان کی کائنات
پھولوں کو چوم چوم گئی بادِ التفات !!!

رہگذاروں پر بڑھتے ہوئے قوموں اور اُمتوں کے رواں دواں قافلوں کو دیکھئے تو ان میں ایک شوقِ قرآنی فکر کے ان طائرانِ پیش رس کا بھی نظر آئے گا جو قرآن کی دعوتِ انقلاب کا پرچم ہستہ آہستہ اپنی منزلِ مقصود کا رُخ کئے ہوئے ہیں۔ اس کاروانِ شوق کی راہ کس قدر کٹھن ہے۔ اس کے قدموں میں کس قدر کانٹے بچھا دیئے گئے ہیں۔ مخالفت کی کیسی کیسی تند آندھیاں ان کے عزم اور ولولوں کو ناکام بنانے کے درپے ہیں۔ بہتان طرازیوں اور افترا پردازیوں کے کیسے کیسے طوفان ان کی حسین اُمنگوں اور آرزوؤں کے خلاف حرکت میں لائے جا رہے ہیں۔ یہ ساری داستانِ ابتلاء و آزمائش ایک طرف اور افرادِ کارواں کی ہمت و جرأت اور جذبۂ استقامت دوسری طرف۔ تاریخ کے مؤرخ سے پوچھئے کہ سب کچھ کیا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ کیا یہ اسی کش مکشِ حق و باطل کے سلسلۂ دراز کی ایک نئی کڑی نہیں جس کی داستانیں تاریخ کے اوراق اور وقت کی دفتین میں محفوظ چلی آ رہی ہیں؟

اور مؤرخ کا قلم بتائے گا کہ یہ اپنی نوعیت کی کوئی نئی داستان نہیں۔ اس کش مکش کا آغاز تو اسی دن ہو گیا تھا جب وحی آسمانی کے پہلے علمبردار نے بھٹکتی ہوئی نوعِ انسانی کو سب سے پہلے اس کی حقیقی منزل کا سُراغ دیا تھا۔ اللہ کے خلیل ابراہیمؑ

نے کونسی مضرت رساں بات کہی تھی جو اپنے اور بیگانے ان پر خدا کی زمین تنگ کرنے کے درپے ہوئے تھے۔ صاحب ضربِ کلیمؑ نے کون سا قابلِ اعتراض قدم اٹھایا تھا کہ بیگانے اور یگانے سب ان کے پاؤں کے کانٹے بن گئے تھے۔ مسیح علیہ السلام نے کس کو دکھ پہنچایا تھا کہ ملوکیت اور پیشوائیت دونوں نے انہیں تختہ دار پر لٹکا کرنے کی ٹھان لی تھی۔ حضور رحمۃ للعالمینؐ نے کون سی ایسی روش اختیار کی تھی جس کی بنا پر غیر تو غیر، اپنے خاندان کے اعزا و اقربا تک ان کے خون کے پیاسے بن گئے تھے۔

طلوعِ اسلام کا قافلہ بھی پہلے دن سے اسی قسم کی نازک صورتِ حال کا شکار چلا آ رہا ہے۔ لیکن باطل کی یورشیں جس طرح تاریخ کے ہر دور میں ذلت، شکست اور نامرادی سے دوچار رہیں اسی طرح اب بھی ان کا وہی حشر ہو رہا ہے۔ قرآنی فکر کا چراغ مخالفت کی جن آندھیوں کے حصار میں ہے وہ اب بھی حسرت و ناکامی میں سر پھوڑ رہی ہیں اور یہ چراغ تاریکیوں کے ہجوم میں اپنی روشنی برابر پھیلائے چلا جا رہا ہے۔ قرآنی فکر کی یہ کشت نو بہار برابر پھولے پھلے جا رہی ہے۔ اور اس کی دلکشائیاں ہر قلبِ سلیم کو اپنے دامنِ اخوت میں سمٹائے چلی جا رہی ہیں۔

طلوعِ اسلام کنونشن کا حالیہ سالانہ اجتماع تاریخِ انسانی کی اسی درخشندہ حقیقت کا ایک عکس جمیل بن کر منظرِ نگاہ ہوا کے سامنے آیا اور جذب و مستی کی وادیوں میں ایسے گہرے نقوش چھوڑ گیا جو کاروانِ شوق کے ذوقِ سفر کو ہمیشہ نئی امنگوں اور تازہ ولولوں سے مالا مال کرتے رہیں گے۔ میر کارواں کے "حرفِ دل نواز" کی اثر انگیزیوں کی تو بات ہی کیا۔ ان کے رفقائے سفر، ان کے سلیم بیٹوں اور ان کی طاہرہ بہنوں اور بیٹیوں نے اس کنونشن میں فکر و بصیرت کے سوز و ساز سے جو دیپ جلائے ان کے لَو سے کتنے ہی دل پگھل پگھل کر اشکبار پلکوں پر آ گئے۔ شدتِ تاثیر سے بار بار آنسوؤں کی جھڑیاں لگتی رہیں اور ایک دنیا نے یہ محسوس کیا کہ داخلی اور خارجی مخالفتوں سے کچھ بھی تو نہیں بگڑا بلکہ ہوا تو یہ کہ

بھٹرے نہیں موسمِ گل کے قدم، قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادیٔ کاکل و لب شاداب و حسین گلگشتِ نظر

یہ تھی وہ طلوعِ اسلام کنونشن جس کے حیات آفریں اجلاس مسلسل چار روز ۲۵۔ بی گلبرگ اور اس سے متصل بنگلوں کی وسعت میں اپنی مخصوص دل کشائی اور قرآنی فکر کے حسنِ زیبائی سے مرجب شادابیٔ قلب و نگاہ بنے رہے۔

سالانہ کنونشن کے انعقاد کا مسئلہ بعض اوقات ایک دردِ سر بن جاتا ہے اور مجلس استقبالیہ اس بار بھی کسی موزوں جگہ کی تلاش میں سرگرداں تھی لیکن میر کارواں کا حسنِ انتخاب کام آ گیا اور یہ طے پا گیا کہ اس دفعہ ایک نئی صورت اختیار کی جائے۔ گلبرگ کالونی کو پاکستان کی نو آبادبستیوں میں جنت نگاہ کی سی قابلِ رشک حیثیت حاصل ہے۔

اسی کالونی کے سب سے پُر رونق بی بلاک میں مُفکرِ قرآن کی وہ قیام گاہ واقع ہے جو دعوتِ قرآنی کے ہزاروں شیدائیوں کے لئے جو پاکستان اور بیرونِ پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں قلب و نگاہ کی دلکشی کا سامان لئے ہوئے ہے۔ اس قیام گاہ کے ساتھ ہی ایک قطار میں ملحقہ شیخ سراج الحق اور شیخ محمد یوسف صاحب کے بنگلے ہیں۔ انہوں نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے اپنے بنگلے کنونشن کے لئے حاضر کر دیئے اور یُوں ایوانِ کنونشن، مہمان کیمپ، طعام گاہ، ٹی سٹال اور بک سٹال کے لئے حسبِ ضرورت جگہ میسّر آگئی۔

۱۰۔ نومبر کی صبح کو ہی کنونشن کے پنڈال اور مہمان کیمپ وغیرہ کے انتظامات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پنڈال کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے شیخ سراج الحق صاحب کے بنگلے کی درمیانی دیوار ہٹا دی گئی اور ۱۱۔ نومبر کی صبح کو ایوانِ کنونشن مہمان کیمپ اور دیگر ضروری انتظامات حسن و خوبی سے تکمیل پا رہے تھے۔ حسبِ ضرورت چبوترہ ساخو بصورت پلیٹ فارم بھی شام تک مکمل ہو گیا اور ۱۲۔ نومبر کی صبح کو جب نمائندگان کی آمد آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر شے اپنے اپنے مقام پر بڑے قرینے سے سجی سجائی اور تیار نظر آ رہی تھی۔

احباب کی آمد کا سلسلہ ۱۲۔ نومبر کو صبح سویرے شروع ہو گیا۔ کراچی کے مہمان خصوصی توطارُان پیش رس کی صورت ایک روز قبل ہی رونقِ محفل بن گئے تھے۔ یہ احباب جن میں پرویز صاحب کے پچیس تیس برس قبل کے پرانے رُفقائے عزیز بھی شامل تھے اور تازہ واردانِ بساط ہوائے دل بھی، سینوں میں بڑے گہرے زخم لئے تشریف لائے تھے۔ انہیں "نام نہاد یگانوں" کے ہاتھوں ایک دلدوز و جگر سوز حادثہ کا شکار ہونا پڑا تھا۔ یہ حادثہ ان کا کوئی ذاتی حادثہ نہیں تھا بلکہ وہ حادثہ تھا جس کا شکار بدقسمتی سے خود قرآن تحریک ہو چلی تھی ——— اور جن لوگوں کو کسی بلند مقصد سے وابستگی کی سعادت نصیب ہوتی ہے وہ جانتے کہ ذاتی حادثات کا سامنا کرنا اتنا جگر گداز نہیں ہوتا جتنا دلدوز و جانگسل اس حادثہ کا برداشت کرنا ہوتا ہے جس کی زد ان کے اُس مقصدِ بلند پر پڑتی ہو۔ کراچی میں قرآن کریم کے درس کا نہایت ڈرامائی انداز میں بغیر کسی سابقہ نوٹس کے یک لخت بند کر دینا ایسا حادثہ تھا جس کا واقع ہونا قرآن کے ان شیدائیوں کے وہم و تصوّر میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ یہ تھا وہ گہرا زخم جسے لے کر یہ احباب کنونشن میں شریک ہوئے تھے، اس انداز سے کہ

دل کا ہر تار لرزشِ پیہم!
جاں کا ہر رشتہ وقفِ سوز و گداز

ان احباب کی بایں نمط کنونشن میں شرکت عجیب و غریب متضاد کیفیات کی موجب تھی۔ ایک طرف اثنائے کنونشن میں سے ہر ایک کی زبان (کراچی میں اس انداز سے درس بند کر دینے کی) مذموم حرکت کے خلاف شکوہ سنج تھی لیکن دوسری طرف، ان چند قرآن کے شیدائیوں نے، جس بے سروسامانی کے عالم میں، بلا تاخیر درس کے

سلسلہ کو جاری کر دیا، اس سے ہر نگاہ ان کے احترام میں جھک جھک پڑتی تھی اور ہر ایک کے لب پر بلا ساختہ اس قسم کے الفاظ لہرا رہے تھے کہ اس قسم کے مخلص کارکنوں کا خلوص و ایثار تحریک کا صحیح سرمایہ اور ان کا عزم و استقلال سب کے لئے قابلِ رشک اور موجب تقلید ہے جس نے اس تصور کو ایک مشہور حقیقت بنا دیا ہے کہ

نکھرتا جا رہا ہے رنگ گلشن
خس و خاشاک جلتے جا رہے ہیں

دن ڈھلنے تک ملک کے گوشے گوشے سے نمائندوں کی آمد کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اور دوپہر کے کھانے پر ان کی اکثریت طعام گاہ میں ایک دوسرے سے گلے مل کر سابقہ کنونشنز کی سہانی یادوں کو تر و تازگی عطا کر رہی تھی۔

۱۲۔ نومبر ——— تعارفی اجلاس

جدھر دیکھئے غنچہ و گل غزل خواں

غروب آفتاب کے تھوڑی دیر بعد ٹھیک ۶ بجے کنونشن کے تعارفی اجلاس کا اعلان ہوا۔ یہ نمائندگان کا اپنا خصوصی اجلاس تھا۔ اور اس اعلان کے چند ہی لمحے بعد وہ اپنی اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے۔ بزم راولپنڈی کے نمائندہ محترم عزیز قریشی کرسئ صدارت پر تشریف لائے۔ حافظ عبدالمجید (پنڈدادن خاں) نے تلاوت کلام پاک سے اجلاس کا افتتاح کیا۔ اور اس کے بعد

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی

کی جانی پہچانی دل کش آواز فضا میں گونجنے لگی ——— مرزا محمد خلیل ایک بار پھر دلوں کی دھڑکنوں سے حسن طلب کی آرزوؤں کو ابھار ابھار کر نغمہ اقبال کی صورت میں زبان پر لیے آئے تھے۔ یہ نغمۂ نو بہاران کے لبوں پر رقص کر رہا تھا اور ایوان کنونشن کی فضا میں جذب و مستی کی کیفیت بپا تھی۔

مرزا خلیل کی نظم کے بعد نمائندگان کے تعارف کا مرحلہ تھا۔ اس سلسلہ کا آغاز پشاور صدر کی بزم سے ہوا۔ پھر مردان، راولپنڈی، سیالکوٹ، ویلوۂ منڈی، لائل پور، سرگودھا، ڈیرہ اسمٰعیل، ملتان، کوئٹہ، لورالائی، پنج کسی، ڈیرہ غازی خاں، لیہ، بستی برانی اور دوسری بزموں کی باری آئی۔ احباب باری باری سٹیج کے قریب پہنچتے اور اپنے نمائندہ بزم کی طرف سے مناسب تعارف کے بعد اپنی اپنی جگہیں سنبھال لیتے۔ سلسلہ تعارف کے دوران میں بڑے روح پرور مواقع سامنے آتے رہے۔ سراج منیر، سچے جانے

پہچانے جیالے نوجوان، جوانِ دو نوں ملتان کی بزم کو زندگی کی نئی حرارت سے گرم رو کئے ہوئے ہیں، اپنی حسن کارانہ سعی و کاوش کی بنا پر سب کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ اُنہوں نے کبھی پنج کسی کی بزم کو سرگرم عمل کیا تھا، پھر لوریلیہ گئے تو کئی سال تک وہاں کی بزم میں حرکت اور عمل کی لہریں پیدا کئے رکھیں۔ اب ملتان پہنچے ہیں تو وہاں قرآنی فکر کا چراغ از سرِ نو روشن کر دیا۔ جو شستہ کردار کا یہ صاحب عزم پیکر پوری کنونشن کے لئے باعث فخر دکھائی دے رہا تھا۔

دلیوانہ منڈی کے چوہدری محمد اکبر حسب سابق اپنے مخصوص دیہاتی انداز میں مسکراہٹیں بکھیرتے مائیک کے سامنے آئے اور انہوں نے باری باری دلیوانہ منڈی کے رفقائے سفر کو تعارف کے لئے سٹیج کے پہلو میں بلایا۔ ضلع گجرات کی اس دور افتادہ بستی کے یہ چوہدری صاحبان، جن کے دم قدم سے دلیوانہ منڈی میں قرآن کی آواز بلند ہوتی ہے، ہر سال کنونشن میں ایک خاص امتیاز کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کا سادہ دیہاتی لباس، سروں پر مخصوص انداز کی پگڑیاں، شانوں پر پڑی ہوئی چادریں، یہ سب کچھ کنونشن میں اپنی مثال آپ ہوتا ہے اور تاثر کی ایک انوکھی کیفیت پیدا کئے رہتا ہے۔

اسی سے ملتا جلتا اثر آفریں انداز پنج کسی کے نمائندگان کا ہوتا ہے۔ چوہدری عطا محمد علوی جب اپنے دیہاتی رفقا کو تعارف کے لئے سب کے سامنے لاتے ہیں تو کنونشن میں کچھ دیر کے لئے ایک انوکھی سی کیفیت ابھر آتی ہے۔ محترم چوہدری صاحب نے اس بار تعارف کے سلسلے میں قرآنی فکر سے متعلق دیہاتی فضا کا جو نقشہ پیش کیا وہ اپنی تفسیر آپ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں کی فضا میں طلوعِ اسلام کا چرچا جن سادہ الفاظ میں ہوتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ دو چار عورتیں جب گھروں سے کھانا لے کھیتوں کا رُخ کئے ہوتی ہیں اور ان میں مقامی بزم اور طلوعِ اسلام کا ذکر چھڑتا ہے تو یہ سارا ذکر ایک لفظ "رسالہ" میں سمٹ آتا ہے اور ان میں سے ایک یوں حرفِ مقصد زبان پر لاتی ہے کہ

"ہاں نی! اوہنوں دی تے "رسالہ" آوندا اے۔"

داری ہاں! اُسے بھی رسالہ (طلوعِ اسلام) آتا ہے)

بالفاظ دگر، وہاں طلوعِ اسلام کے شیدائیوں کا ذکر ایک لفظ "رسالہ" سے تکمیل پا جاتا ہے۔

بستی برمانی کے احباب بھی پچھلے سال کی طرح کنونشن میں تشریف لائے تھے۔ ضلع ڈیرہ غازی خاں کی اس چھوٹی سی بستی میں یہ چند احباب جس عزم و ہمت سے مخالفت کی آندھیوں میں قرآنی فکر کا دیا روشن کئے ہوئے ہیں اس سے متعلق جب نمائندہ بزم محترم مہر علی کا ذکر آیا اور اس کے ساتھ ہی اس زہرہ گداز ابتلا و آزمائش کا بھی جس سے اس نوجوان کو گذرنا پڑا تو احباب کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور پرویز صاحب تو دیوانہ وار اٹھ کر اس نوجوان

سے لپٹ گئے۔ اسی تعارف سے پہلی بار واضح ہوا کہ دُور افتادہ بستیوں کے یہ من چلے قرآنی فکر کے عشق و مستی میں کیسی کیسی صبر آزما مصیبتوں اور جگر پاش ابتلائیں میں عزم و استقلال کی چٹانیں بن کر کھڑے ہیں۔

بزموں کے نمائندوں کا تعارف اختتام کو پہنچ گیا لیکن اس سلسلہ تعارف کی آخری کڑی ابھی باقی تھی ——

یہ کڑی کراچی سے آمدہ احباب کے تعارف سے متعلق تھی۔ اور اس تعارف کے پس منظر میں ایک حادثہ کارفرما تھا جس کا نقاب اٹھانے کے لئے ناظم ادارہ کو مائیک پر آنا پڑا۔ انہوں نے تاثرِ قلبی سے لرزتی ہوئی آواز میں بتایا کہ طلوعِ اسلام کی تاریخ کا یہ اندوہناک واقعہ ہے کہ جو احباب بزم طلوعِ اسلام کراچی کے نشوو ارتقا کے لئے اپنا خونِ جگر پیش کرتے رہے اور اُس وقت بھی میر کارواں کے رفیقِ سفر چلے آ رہے ہیں جب کہ ابھی بزموں کا قیام بھی عمل میں نہیں آیا تھا، وہ اس کنونشن میں کسی بزم کے نمائندوں کی بجائے ادارہ کے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریکِ اجلاس ہوئے ہیں۔ اس واقعہ کی تفصیل انہی احباب کی زبانی سامنے آسکے گی۔

اس اعلان کے بعد کراچی کے احباب سامنے آئے اور انہوں نے اپنے تعارف کے ساتھ ساتھ اس حادثہ کی تفاصیل بھی بیان کیں جو بزمِ کراچی پر گذرا۔ مبارک ہیں یہ احباب کہ ان کے جذبۂ ایمانی، ذوقِ یقین اور عزم و ہمت نے نہ صرف تحریک کے مستقبل کو فتنہ سامانی کی یلغار سے بچا لیا بلکہ درسِ قرآن کے از سرِ نو سلسلہ آغاز سے شادابیٔ قلب و نگاہ کے امکانات روشن کر دیئے۔ اور اپنے مرکز کو یہ یقین دلایا کہ

میخانہ سلامت ہے تو ہم سُرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

تعارفی سلسلہ کے اختتام پر صدر کنونشن کمیٹی مرزا محمد خلیل صاحب نے اپنے استقبالیہ کے ذریعے احباب کا خیر مقدم کیا اور ناظم ادارہ نے اپنی رپورٹ پیش کی۔

۱۳- نومبر —— پہلا اجلاس

۱۳- نومبر کو نو بجے صبح اس روز کی پہلی نشست ایوانِ کنونشن میں ہوئی۔ یہ نمائندگان کا خصوصی اجلاس تھا۔ محترم شیخ غلام نبی صاحب دلیہ اکرسیٔ صدارت پر تشریف لائے۔ حافظ عبدالمجید صاحب نے تلاوتِ کلام پاک سے کارروائی کا آغاز کیا۔ مرزا محمد خلیل صاحب نے کلامِ اقبال سے دلوں کو گرمایا اور اس کے بعد میر کارواں

حرفِ دل نواز

محترم پرویز صاحب اپنے استقبالیہ خطاب کے لئے مائیک پر رونق افروز ہوئے انکے اس خطاب کا عنوان تھا —— حرفِ دلنواز

غزل سرائے و نوا ہائے رفتہ باز آور
بایں فسردہ دلاں حرفِ دلنواز آور

مفکرِ قرآن کے اس "حرفِ دل نواز" میں حیاتِ اجتماعی کے بڑے اہم اور بنیادی حقائق مضمر تھے۔ یہ شاید ان کا پہلا خطاب تھا جس میں دعوتِ قرآنی کے علمبرداروں کو ان نازک ترین گوشوں سے باخبر کیا گیا تھا جو ہر ابھرتی ہوئی تحریک کے لئے ابتلاء و آزمائش کا سامان بنتے ہیں۔ یوں تو پرویز صاحب زندگی کی ہر اہم حقیقت کا سراغ قرآن کی زبان سے پیش کرتے ہیں لیکن اس خطاب کا تو خصوصی امتیاز یہی تھا کہ انہوں نے قرآن کی زبان سے اس ذہنیت کی پوری تفصیل رُفقائے سفر کے سامنے رکھ دی جو ہمدردی، دوستی، رفاقت اور تعاون کے نام پر ہر تحریک کے مستقبل کو زیر و زبر کرنے کے درپے رہتی ہے۔ جو ذاتی مقاصد کی بجا آوری کے لئے ہر تحریک میں ہراول دستہ بن کر شریک ہوتی ہے اور انہی مقاصد کے پیشِ نظر تحریک کو خطرے میں ڈال کر رخصت ہو جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ قرآنی نظام کی انقلابی تحریک کے داعیوں کو اس قسم کے خطرات سے محتاط رہنے کی ازلبس ضرورت ہے۔

محترم پرویز صاحب نے خطاب کے آخر میں احباب سے اپیل کی کہ وہ وقت کے تقاضوں کو لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھیں۔ دنیا اپنے مختلف تجارب میں ناکامی کے بعد سرِ راہ مایوس کھڑی ہے۔ قرآن کے بابِ عالی کے سوا اس کی نجات و سعادت کی کوئی اور راہ نہیں اس لئے اٹھئے اپنی رفتار کو تیز تر کر دیجئے۔ اور نوعِ انسانی کو بتایئے کہ اس کی مشکلات کا حل قرآن کی بارگاہ کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

۱۳۔ نومبر ــــــ دوسرا (کھلا) اجلاس

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ پہلا اجلاسِ عام دو بجے بعد دوپہر شیخ سراج الحق صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ اجلاس کے آغاز سے قبل ہی پنڈال کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ کارروائی کا آغاز محترم عبداللطیف نظامی کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا اور خلیل مرزا کی نظم کے بعد مفکرِ قرآن اپنا اہم خطاب ـــــ مومن کسے کہتے ہیں؟ ـــــ لے کر مائیک پر آئے۔ خطاب کیا تھا حسنِ بصیرت کا ایک حیات آفریں شاہکار تھا جس نے پورے ایوان میں جذبِ انہاک کی ایک وجد آفریں کیفیت طاری کر دی۔ یوں نظر آتا تھا کہ گویا

چمن ہے شعلۂ گل سے چراغاں
بہار آئی نوائے آتشیں سے

مردِ مومن کا مقام اور مفکرِ قرآن کا اندازِ بیان۔ پہلے انہوں نے اس حقیقت سے اجمالاً نقاب اُٹھا اور

بتایا کہ

"قرآن کی تعلیم انسان کو وہ کچھ بنا دیتی ہے جو خدا چاہتا ہے کہ وہ بن جائے یعنی انسان اس منزل و منتہیٰ تک پہنچ جائے جو اس کے سفرِ حیات کے لئے صفحۂ ارض پر مقدر کی گئی ہے۔ قرآن نے ایسے فرد کو مومن کہہ کر پکارا ہے۔"

پھر وہ اجمال سے آگے بڑھے اور تفصیل کے رنگ میں آئے تو جماعت مومنین، اس کے نظام میں ایک فرد کی حیثیت، انفرادی نیکیوں کے مروجہ تصور، عالمگیر انسانیت کے قرآنی نصب العین اور اس سے متعلق پروگرام کا ایک ایک گوشہ نکھار اور انکھار کر ایوان کے سامنے آئے۔ مردِ مومن کن عظیم القدر صفات کا حامل ہوتا ہے۔ قرآن کی تعلیم اُسے شرفِ انسانیت کی کن بلندیوں پر فائز کرتی ہے اور پھر مومنین کی اس جماعت کے ہاتھوں انسانی زندگی میں کس قسم کا معاشرہ متشکل ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں مرد اور عورت کس طرح شانہ بہ شانہ سفرِ زندگی کو طے کرتی ہیں۔ ان تفاصیل کو علیٰ وجہ البصیرت قرآن کی زبان سے پیش کرنا مفکرِ قرآن ہی کا حصّہ تھا، کسی مقرر اور خطیب کا نہیں۔

محترم پرویز صاحب نے وضاحت کی کہ عالمگیر انسانیت کے لئے قائم کردہ جماعتِ مومنین کا یہ نظام کیونکر تفرقہ بازی کے شرک سے پاک ہوتا ہے۔ اس میں ربطِ باہمی اور اتحاد و ائتلاف کی کس قدر خوشگوار کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔ دلوں میں کس طرح اخوت اور محبت کی لہریں دوڑتی ہیں اور اس کے صدقے میں کیسی خوشگواریاں اور سربلندیاں جماعتِ مومنین کے حصّے میں آتی ہیں۔

۱۲۔ نومبر ــــــ تیسرا اجلاس

غروبِ آفتاب کے تھوڑی دیر بعد، جبکہ آسمان پر ستاروں کی انجمن آراستہ ہو رہی تھی، اس روز کا تیسرا اجلاس کنونشن کے ایوان میں شروع ہوا۔ چوہدری فیروز دین صاحب نے مسندِ صدارت سنبھالی اور محترم عزیز قریشی صاحب نے تلاوتِ کلام پاک سے اجلاس کا افتتاح کیا۔ یہ مجلس نمائندگان کنونشن کی خصوصی مجلس تھی جس سے محترم حسن عباس رضوی، ڈاکٹر صلاح الدین اکبر، اور ڈاکٹر سید عبدالودود نے خطاب کرنا تھا۔ یہ وہ احباب تھے جنہوں نے مفکرِ قرآن کی فکرِ قرآنی سے قلب و نگاہ کے لئے روشنی کی کرنیں حاصل کیں اور اب اپنے تاثرات سے کر ایوان کے پلیٹ فارم پر آ رہے تھے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ فیضؔ کے الفاظ میں جب

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

طلوعِ اسلام کی دعوت قرآنی کے سلسلے میں سالہا سال سے "حدیثِ یار" کے جو عنوان نکھر اور اُبھر کر منظرِ عام پر آرہے ہیں ان سے فکر و بصیرت کے شبستانوں میں نئی نئی تنویریں جگمگا اُٹھی ہیں۔ بشرفِ انسانیت کا بول بالا ہو رہا ہے، سُلطانی و مُلائی و پیری کی دستبرد سے لٹا ہوا حسن کائنات پھر نکھر نکھر کر نکہت فشاں ہو رہا ہے۔ ان احباب کے مقالات علیٰ وجہ البصیرت شہادت دے رہے تھے کہ قرآن کی دعوتِ انقلاب نے قلوب و اذہان کے ہر گوشے کو کس حد تک مستنیر کیا ہے اور اس کا مستقبل کس قدر خوشگوار اور خوش آئند ہوگا۔

سب سے پہلے محترم حسن عباس رضوی اپنا مقالہ لے کر مائیک پر آئے۔ اس مقالہ کا عنوان تھا۔

تحریکِ طلوعِ اسلام کا پس منظر

محترم رضوی صاحب نے سب سے پہلے یہ واضح کیا کہ قرآن کی روشنی میں حضور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کے مقدس ہاتھوں انسانی زندگی میں جو عالم آرا انقلاب پیدا ہوا اس نے کس حسن انداز سے دُنیا و آخرت کی ثنویت کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت میں سمو دیا اور اس کے بعد ملوکیت کی کارفرمائی سے دُنیا کس طرح اس کی برکات سے محروم ہو گئی۔

پھر انہوں نے اس حقیقت کی وضاحت کی کہ تحریک پاکستان کے پہلو بہ پہلو تحریک طلوعِ اسلام کا آغاز کس قدر ضروری اور تقاضائے وقت کے عین مطابق تھا۔ اور مذہبی پیشوائیت کیوں دونوں کے خلاف محاذ کھڑا کرنے پر مجبور ہوئی۔

محترم رضوی صاحب نے اس کے بعد، قرآن کی دعوتِ فکر کے مختلف و درخشندہ گوشے بوضاحت پیش کئے اور احباب سے اپیل کی کہ اس تحریک کو جو خدا اور رسول کی امانت اور شمعِ قرآنی سے مستنیر ہے آگے بڑھائیں اور بہر نوع اس کی حفاظت کریں۔

حسن عباس رضوی کے بعد ڈاکٹر صلاح الدین اکبر کی باری تھی۔ ڈاکٹر صلاح الدین جو بڑی فکر انگیز کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور تحریکِ پاکستان کے مقاصد عالیہ کے رمز شناس بھی۔ جن کے روشن چہرے پر ایک صاحبِ فکر کی سنجیدہ سی مسکراہٹ کھیلتی نظر آتی ہے، احباب کے سامنے آئے۔ ان کے مقالہ کا عنوان تھا — آپ بیتی۔ ڈاکٹر صاحب بظاہر اس مقالہ کے ذریعے اپنی آپ بیتی پیش کر رہے تھے لیکن درحقیقت یہ ملت پاکستان کے ہر اس فرد کی آپ بیتی تھی جو اسلام کو خدا کا سچا دین سمجھنے کے باوجود، اس کے مروجہ تصورات میں قلب و نگاہ کا اطمینان نہیں پاتا۔ تحریک پاکستان نے اس کی خلش کو امنگوں اور امیدوں کے اطمینان میں بدلا لیکن اس تحریک کی کامیابی کے بعد ایک جداگانہ مملکت کا قیام بھی وجہ تسکین نہ بن سکا۔ ڈاکٹر صلاح الدین کی یہ دردبھری کہانی دراصل ان زخموں کی ٹیس کا بے تابانہ اظہار تھا

جو تحریک پاکستان کے ہر مخلص شیدائی کو آج تک برابر مسلسل پیچ و تاب بنائے چلی آ رہی ہیں۔ جن پر مذہبی اجارہ داری اور سیاسی مصلحت کوشیوں سے آج تک نمک پاشی کا سلسلہ جاری ہے۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ سرشک گرم و آہ سرد کے امتزاج سے یہ آپ ملی ترتیب پائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی آواز میں سلگتی ہوئی آگ کا سا سوز و ساز تھا اور ایوان کنونشن میں کتنی ہی پلکوں پر بار بار آنسوؤں کے قطرے نمودار ہوتے رہے۔

اب ڈاکٹر سید عبدالودود پلیٹ فارم پر آئے قرآنی دعوت کے جیتے جاگتے پیکر ڈاکٹر عبدالودود جو گفتار سے زیادہ کردار کو اہمیت دیتے ہیں اور ہر نئی دعوت کو قبول کرنے میں بڑی احتیاط اور سوچ بچار سے کام لیتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف "جمہوریت" کا بظاہر "پامال سا" موضوع لے کر مائیک پر آئے تھے لیکن انہوں نے بین الاقوامی تحقیقات کی روشنی میں جب اس ایک لفظ سے متعلق عالمگیر ہنگامہ آرائیوں کا تجزیہ کیا تو واضح ہو گیا کہ جس لفظ کے نام پر فضائے عالم میں سینکڑوں ہنگامے برپا ہیں وہ ابھی تک شرمندۂ معنی نہیں ہو سکا۔ یہ ایک جذباتی نعرہ ہے جس کا مفہوم ابھی تک کوئی علمی بارگاہ متعین نہیں کر سکی۔

یہ مقالہ پیش کرنے سے قبل ڈاکٹر صاحب نے تحریک طلوع اسلام سے متعلق اپنے ذاتی تاثرات پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی اور بتایا کہ پرویز صاحب کے درس قرآن نے ان کے قلب و نگاہ کے زاویوں میں کس قدر تبدیلی پیدا کی ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ وہ مفکر قرآن کی عظیم شخصیت سے بھی متاثر ہوئے ہیں اور اس عظمت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج دنیا کی بڑی بڑی علمی بارگاہوں میں ان کی دعوت قرآنی غور و فکر کا محور بن گئی ہے لیکن اس شہرۂ آفاق اہمیت کے باوجود انہوں نے نہ تو لیڈری کا کوئی دعویٰ کیا ہے اور نہ پیری مریدی کا کوئی سلسلہ قائم کیا ہے۔ لاکھوں انسان ان کی دعوت فکر سے وابستہ ہیں لیکن وہ دوستوں کے دوست ہیں اور اپنے یتیم پوتے پوتیوں اور طاہرہ بیٹیوں کے شفیق باپ۔ —— اس سے زیادہ نہ انہیں کوئی ادعا ہے نہ کوئی دعوےٰ۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ کے سامنے اس قسم کی کوئی اور مثال ہے تو اسے پیش کیجئے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب سے ایوان کی فضا بیحد متاثر تھی۔ اس بصیرت افروز خطاب کے بعد یہ اجلاس اختتام پذیر ہو گیا۔

۱۴- نومبر —— پہلا اجلاس (نمائندگان)

---

۹ بجے صبح محترم حسن عباس رضوی (کراچی) کی صدارت میں نمائندگان کنونشن کا اجلاس عام شروع ہوا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد محترم عزیز قریشی (راولپنڈی) کالج وہاں سے متعلق قرارداد لے کر سامنے آئے۔ قرارداد میں اس مقصد کی تکمیل کے لئے شیخ سراج الحق صاحب (لاہور) کی صدارت میں شیخ صاحب موصوف ،

مرزا محمد خلیل (لاہور) اور راجہ محمد اکرم صاحب ایڈووکیٹ (لاہور) پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی تجویز پیش کی گئی ایوان نے قرارداد کو باتفاق رائے سے منظور کر لیا۔

دوسری قرارداد مرزا محمد خلیل صاحب نے پیش کی۔ اس قرارداد میں بزموں پر یہ واضح کیا گیا کہ طلوعِ اسلام کی دعوت قرآنی کو عام کرنے کے لئے ادارہ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹس کی تعمیم عام کی اشد ضرورت ہے اور اس ضرورت کے پیش نظر بزموں کو ادارہ سے مستقل رابطہ قائم کرنا چاہیئے اور اپنی ضرورت سے ادارہ کو مطلع کر دیا جائے۔

محترم محمود اسلام (کراچی) نے قرارداد میں ترمیم پیش کی کہ اس مقصد کے لئے بزموں کو اپنی آمدن کا ۱/۴ حصّہ مختص کر لینا چاہیئے۔ شیخ محمد اقبال (گوجرانوالہ) نے اس پابندی کی مخالفت کی اور کہا کہ جب بزمیں اس سلسلہ اشاعت کو اپنا فریضہ سمجھتی ہیں تو ایسی صورت میں ۱/۴ کی پابندی غیر ضروری اور نامناسب ہے۔ قرارداد کی وضاحت کے سلسلے میں خواجہ محمد عبداللہ بٹ (سیالکوٹ) محترم عزیز قریشی (راولپنڈی) مرزا ظہور الحق (راولپنڈی) ملک ظہور احمد (راولپنڈی) کیپٹن غلام حیدر (دلیہ) اور صدر اجلاس محترم حسن عباس رضوی، نے بھی تقریریں کیں۔ قرارداد منظور ہوئی اور اس میں باتفاق یہ طے ہو گیا کہ بزمیں اپنی آمدن کا کم از کم ۱/۴ حصّہ پمفلٹوں کی اشاعت کے لئے لازماً کام میں لائیں۔

تیسری قرارداد میں جو محترم عزیز قریشی (راولپنڈی) نے پیش کی بزموں کیلئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ ہر سالانہ کنونشن کے موقع پر اپنی کارکردگی کی مفصّل رپورٹ پیش کریں، جس میں درس قرآن، پمفلٹوں اور دیگر مطبوعات ادارہ کی اشاعت کے علاوہ نئے اراکین کے اضافہ اور طلوعِ اسلام کے نئے خریداروں کی پوری تفصیل پیش کی جائے۔

قرارداد اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی۔

چوتھی قرارداد بھی محترم عزیز احمد قریشی (راولپنڈی) نے پیش کی اور باتفاق منظور ہوئی۔ اس قرارداد میں بزموں پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے ہاں جگہ جگہ ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے پرویز صاحب کے درس قرآن کا اہتمام کریں۔

پانچویں قرارداد میزان پبلیکیشنز سے نجات فنڈ کی رقوم کی بازیابی سے متعلق تھی اسے کرسی صدارت کی طرف سے پیش کیا گیا اور ایوان نے اسے باتفاق رائے منظور کر لیا۔

کرسی صدارت کی طرف سے ایک اور قرارداد (۶) پیش کی گئی جس میں میاں عبدالخالق اور ان کے رفقاء کی طرف سے گشتی چٹھیوں کی صورت میں جھوٹے پروپیگنڈے کی مہم پر اظہار افسوس کیا گیا۔ قرارداد میں مذکورہ حضرات

سے ان تخریبی سرگرمیوں کو ختم کرنے کی خواہش کی گئی اور محترم پرویز صاحب کے لئے احترام و محبت کا اظہار کرتے ہوئے ان کے لئے خوشگوار صحت اور درازیٔ عمر کی دعا کی گئی۔ قرارداد اتفاقِ رائے اور پُرجوش ولولوں کے ساتھ منظور کر لی گئی۔

اس قرارداد کے بعد ناظم ادارہ طلوعِ اسلام نے بزموں کے دستور اساسی اور اصولی ہدایات میں یہ ترمیم پیش کی کہ بزم کی رکنیت قبول کرتے ہوئے اگر کوئی صاحب ماہانہ عطیہ کی استطاعت نہ رکھتے ہوں تو نمائندہ بزم کی صوابدید پر اُسے اس سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ ایوان نے اس ترمیم کی منظوری اتفاقِ رائے سے دے دی۔

ساتویں قرارداد محترم عزیز احمد قریشی (راولپنڈی) نے پیش کی۔ اور ایوان نے اسے بالاتفاق منظور کر لیا۔ اس قرارداد میں تمام شرکائے کنونشن کی طرف سے محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کی ان مخلصانہ اور گرانقدر خدمات پر سپاس و تشکر کا اظہار کیا گیا جو اُنہوں نے محترم پرویز صاحب کے اپیلیشنوں کے سلسلے میں سرانجام دیں۔ اور اس کے ساتھ بارگاہِ ربّ العزت میں دُعا کی گئی کہ وہ قرآنی نظامِ ربوبیت کی تکمیل کے لئے پرویز صاحب کو درازیٔ عمر سے بہرہ ور فرمائے۔ محمد اسلم صاحب (کراچی) نے تحریک کی کہ اگر کراچی کی طرح کسی مقام پر بزم میں ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے تو اس سے باحسن الوجوہ عہدہ برآ ہونے کے لئے اصولی ہدایات میں کوئی واضح شق موجود ہونی چاہیئے۔

صدرِ اجلاس نے واضح کیا کہ ہماری بزمیں جس مقدس مشن کے لئے کام کر رہی ہیں اس کی موجودگی میں یہ کبھی تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کسی فرد یا گروہ کو ایسی ہنگامی صورت پیدا کرنے کی جرأت ہو سکے گی۔ نہ ہی ہم سمجھتے ہیں کہ کسی اور جگہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکت ہو گی۔ بایں ہمہ، احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اساسی دستور و ہدایات میں اس سلسلہ میں بزموں کو راہ نمائی دی جائے۔ اس کے لئے بہتر یہ ہو گا کہ ادارہ سوچ بچار کے بعد اصولی ہدایات میں اس قسم کی ایک شق کا اضافہ کرے۔ ایوان نے اس تجویز پر کامل اتفاق کا اظہار کیا۔

کرسیٔ صدارت کی طرف سے دو مزید قراردادوں میں محترم شیخ سراج الحق اور شیخ محمد یوسف صاحب کا شکریہ ادا کیا گیا کہ انہوں نے کنونشن اور اس کے نمائندگان کے لئے اپنے اپنے بنگلوں کے لان کنونشن کمیٹی کی تحویل میں دے دیئے اور اس طرح پنڈال و قیام گاہ وغیرہ کے لئے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کیں۔

صدرِ اجلاس کی طرف سے ایک اور قرارداد میں بزم طلوعِ اسلام لاہور کا شکریہ ادا کیا گیا کہ اس نے اپنے مہمان نمائندوں کے قیام و طعام اور دیگر ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ممکن انتظامات کئے۔

بزم لاہور اور کنونشن کمیٹی کے صدر مرزا محمد خلیل صاحب نے ایک قرارداد میں شرکائے کنونشن کا شکریہ

ادا کیا کہ موسمی شدائد اور دیگر رکاوٹوں کے باوجود انہوں نے اپنی شرکت سے کنونشن کو کامیاب بنایا۔

(یہ قرارداد یں روئیداد کی آخر میں دیکھئے)

مختصر وقفے کے بعد یہ اجلاس پھر جاری ہوا تو صدر اجلاس محترم حسن عباس رضوی نے کالج کے قیام کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں ایوان سے خطاب کیا اور واضح کیا قرآنی تحریک کو نشرو ارتقاء کے آئندہ مراحل شایانِ شان کامیابی کے ساتھ طے کرنے کے لئے اپنی درسگاہ کے قیام کی اشد ضرورت ہے اور احباب کو اسی اجلاس سے اپنی فیاضانہ امداد و تعاون کا آغاز کر دینا چاہیئے۔

محترم رضوی صاحب کے اس پُر اثر خطاب کے بعد عطیوں کا اعلان شروع ہو گیا۔ ان میں وہ احباب بھی شامل تھے جنہوں نے ہزار ہزار، دو دو ہزار اور تین تین ہزار کی پیش کش کی اور وہ بھی جنہوں نے اپنی استطاعت سے کہیں بڑھ چڑھ کر مستقل عطیوں کے ساتھ کالج کی تکمیل تک دس دس، بیس بیس، تیس تیس روپے ماہانہ ادائیگی کے اعلان کئے۔ یہ سلسلۂ تعاون ابھی جاری تھا کہ دوپہر کے کھانے کا مرحلہ آگیا اور یہ تحریک آئندہ اجلاس پر ملتوی کر دی گئی۔

خاتمۂ اجلاس سے قبل محترم پرویز صاحب آئندہ اجلاس کے اعلان کے لئے مائیک پر تشریف لائے۔ انہوں نے وضاحت فرمائی کہ کھانے کے بعد ٹھیک دو بجے اسی پنڈال میں وہ اہم مجلس مذاکرہ منعقد ہو رہی ہے جس میں ہمارے کالجوں کے پروفیسر اور طلباء اپنے خیالات و تاثرات لے کر سامنے آرہے ہیں۔ ان میں ہماری طاہرہ بیٹیاں اور بہنیں بھی شریک ہوں گی۔ ان کا احترام شرفِ انسانیت کا جزو ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کے لئے جلسہ گاہ میں نشستوں اور آمد و رفت کے سلسلہ میں ابھی سے مناسب انتظامات کی تکمیل کی جائے۔

۱۴- نومبر ــــــ یادگار مجلس مذاکرہ

دو بجے سے قبل کنونشن کا پنڈال ایک نئے حسنِ ترتیب سے آراستہ ہو چکا تھا۔ پنڈال کا ایک وسیع حلقہ خواتین کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ جس میں پردہ کا معقول انتظام تھا۔ لیکن سالہائے ماسبق کے مقابلہ میں اس دفعہ اس طبقہ کا ذوقِ قرآنی اور بڑھتی ہوئی حاضری اپنی مثال آپ تھی۔ یہ منظر قرآن کے دیدۂ زرگی بے خوابیوں اور شدتِ آرزو کی بے تابیوں کا مبارک صلہ تھا۔ جو اُن کی طاہرہ بیٹیوں اور بہنوں کی صورت میں انبوہ در انبوہ

اُمنڈا چلا آرہا تھا۔ پنڈال کے مردانہ حصے میں بھی ذوق و شوق کی یہی کیفیت تھی۔ قرآنی تحریک کے سلیم بیٹے قرآن کے پیغام کو سننے اور سنانے کے لئے دلوں میں پاکیزہ اُمنگیں لئے حاضر ہوئے تھے۔ انہوں نے قرآن کی آواز کو سنا اور سمجھا تھا۔ وہ اس مقامِ انسانیت سے متعارف ہو رہے تھے جہاں قرآن انہیں پہنچانے کے لئے آیا تھا۔ ان کے قلب و نگاہ کی دھڑکنیں ان طالب علموں سے قطعاً مختلف تھیں جو غلط تعلیم و تربیت کے گمراہ کن ماحول میں اپنے آپ کو بھی کھو بیٹھے اور قوم کی اُمیدوں کو بھی زیرِ نو خطروں میں ڈال دیا۔ یہ اجلاس ایک کشتِ نوبہار کا انقلاب آفریں سماں پیدا کئے ہوئے تھا۔ ہاں ایک کشتِ نوبہار جس کے بیج مفکرِ قرآن نے دن رات بوئے۔ خونِ جگر سے ان کی آبیاری کی اور یہ فصل نوبہار اب برگ و بار لا رہی تھی۔ مفکرِ قرآن کی بے تاب نگاہیں اس کشتِ زارِ قرآنی نگاہوں کو اپنے سامنے پا رہی تھیں۔ ان کا دل و فورِ مسرت سے لبریز تھا۔ جذب و مستی کی یہ کیفیت دل میں لئے وہ مائیک کے سامنے آئے۔ پنڈال کی وسعتوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ پورا ایوان گوش بر آواز تھا جب انہوں نے فرمایا کہ ——

”گذشتہ چار پانچ سالوں سے ہماری کنونشن کی یہ مجلس ایک خصوصی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ اس مجلس کے ذریعے نوجوانانِ ملت کے تاثرات اُبھر اور نکھر کر منظرِ عام پر آتے ہیں۔ آج کا یہ نوجوان طبقہ مستقبل کا معمار بنے گا اور جیسا یہ خود ہوگا ویسی ہی کل کی قوم ہوگی۔ طلوعِ اسلام نے ان کی تربیت کی ضرورت و اہمیت کو محسوس کیا اور یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ قرآن کی آواز اس طبقہ میں کافی مقبول ہو رہی ہے۔ اس اجلاس میں ان نوجوانوں کے دل کی دھڑکنیں آپ کے کانوں تک پہنچے گی۔

اس اجلاس کی صدارت میری اس طاہرہ بہن کے سپرد کی جا رہی ہے جس کا وجود اس امر کی جیتی جاگتی شہادت ہے کہ صحیح تربیت سے قوم کی بیٹیوں میں کیسی عظمتِ کردار نمایاں ہو جاتی ہے۔ محترمہ ثریا عندلیب، خلیفہ شجاع الدین مرحوم کی دخترِ فرخندہ اختر ہیں۔ وہ خلیفہ شجاع الدین مرحوم جنہیں آپ سب جانتے ہیں، جو انجمن حمایت اسلام کے صدر، صوبائی اسمبلی کے سپیکر اور تحریک پاکستان کے علمبردار رہے۔ ایسے قابل قدر باپ کی نگرانی میں تربیت حاصل کرنے والی قابلِ فخر بیٹی، اس اجلاس کی صدارت کرے گی اور اس اجلاس میں میرے سلیم بیٹوں کے علاوہ، میری طاہرہ بیٹیاں بھی آپ سے خطاب کریں گی —— میری

نہیں، وہ آپ سب کی بھی طاہرہ و بیٹیاں ہیں۔"

پرویز صاحب کے خطاب کے خاتمہ پر محترمہ ثریا عندلیب مسند صدارت پر تشریف لائیں۔ اور انہوں نے "اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ"... کی آیات سے اپنے خطبۂ صدارت کا آغاز کیا۔ قرآن کی آواز ان کے لب و لہجہ کی لرزشوں میں اُبھر اُبھر کر فضا میں جذب و انہاک کی اثر آفریں کیفیت پیدا کر رہی تھی اور پورے ایوان پر ایک سکوت کا عالم طاری تھا۔

خطبۂ صدارت کے بعد محترم نذیر فاروقی مائیک پر آئے احباب کے اس جانے پہچانے اور ہم نوادِ ہم صفیر مغنّیٔ آتش نفس نے اقبال کا دعائیہ نغمہ چھیڑا ——

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

اقبال کا نغمہ، نذیر فاروقی کی آتش نوائی اور ایوان کی اثر آفریں فضا۔ چاروں طرف بیخودی کا سماں بندھ گیا۔

اس حسنِ آغاز کے بعد محترم خالد اسلام اپنا مقالہ —— طلوعِ اسلام کی تحریک کا پس منظر —— لے کر پلیٹ فارم پر آئے۔ خالد اسلام، پنجاب انجینئرنگ یونیورسٹی کے پروفیسر، تحریکِ قرآنی کے شیدائی اور پرویز صاحب کے قابلِ فخر سلیم بیٹے جن کے قلب و نگاہ قرآن کی آواز کا گہرا اثر لئے ہوئے ہیں۔ اس سعید نوجوان کی تربیت اُس سعادت بخت ماں کی آغوش میں ہوئی ہے جس نے عمر کے بہت ابتدائی حصہ ہی سے طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر سے معمور فضاؤں میں سانس لینا شروع کیا اور جو اس وقت اس فکر کی بہت پُر جوش مبلغہ ہیں۔

خالد صاحب نے نہایت نپے تُلے الفاظ میں بتایا کہ طلوعِ اسلام کس طرح اس دور کے "بھٹکے ہوئے آہو" کو خراماں خراماں "سوئے حرم" لے چلا ہے اور اسے تشتتِ فکر و نظر کی آوارگی سے نکال کر کس طرح قرآنی فکر کے مرکز پر مرکوز کر دیا ہے۔ وہ اس تحریک کے ماضی کے خط و خال کو سامنے لا رہے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے، تاریخ کا پروفیسر، کلاس روم میں متعلمین کی نگاہوں کے سامنے سے پردے اٹھائے چلا جا رہا ہے —— طلوعِ اسلام کی بیکسر فکری تحریک کو پیش کرنے کا یہ انداز بڑا ہی مؤثر اور بلیغ تھا۔

اس مقالہ کے اختتام کے بعد، پرویز صاحب پھر مائیک کے سامنے آئے اور کہا کہ اقبال نے کہا تھا کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمین کے ہنگامے
بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی۔

اس ہاایوں بخت نوجوان نے جب اپنے لئے یونیورسٹی میں مضمون کا انتخاب کیا تو اندیشۂ ہائے افلاکی پر زمین کے ہنگاموں کو ترجیح دی اور اپنے لئے طبقات الارض کا مضمون منتخب کیا۔ یہ نوجوان تھے، پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔ اے (فائنل) کے طالب العلم ــــــ منیر غضنفر ــــــ جنہوں نے اپنے مقالہ میں بتایا کہ طلوعِ اسلام کی تحریک کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ یہ تحریک فکر کو اپیل کرتی ہے اور مسلمان صدیوں سے سطحی جذبات کا خوگر ہو چکا ہے۔ مقالہ فکر کی صحت اور اسلوبِ بیان کی شگفتگی کی بنا پر سامعین کی گہری توجہ اور بشاشت کا مرکز بنا رہا۔ طلوعِ اسلام نے انداز ہی ایسا لیا ہے جس میں نہ فکری موضوع میں ایسی یبوست پیدا ہو جائے کہ سامعین خراٹے لینے لگ جائیں اور نہ ہی شگفتگی میں وہ بے باکی جس سے انسان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب ہو جائے۔

منیر غضنفر صاحب کے بعد وہ طاہرہ بیٹی اسٹیج پر آئیں جن کا انتظار ہر کنونشن کے بعد سے آنے والی کنونشن تک برابر رہتا ہے یعنی محترمہ زاہدہ منظور جو اب لاہور کالج میں انگریزی کی لیکچرار ہیں۔ سامعین انکے ان اردو کے چبھتے ہوئے فقرات کو سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھے جو اپنے اختصار کے پہلوؤں میں گہری تنقید کے سینکڑوں نشتر چھپائے ہوتے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس مرتبہ، موضوع کی گہرائی کے پیشِ نظر، اپنا مقالہ انگریزی میں پیش کیا۔ اور سننے والوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ محترمہ موصوفہ کو جس قدر عبور اردو پر حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ انگریزی زبان پر ہے۔ ان کے مقالہ کا موضوع یہ تھا کہ

طلوعِ اسلام کی فکری تحریک کے لئے فضا سازگار نہیں

انہوں نے فضا کی اس ناسازگاری کا نقشہ کچھ اس انداز سے کھینچا کہ قدامت پرست طبقہ کے تنگ و تاریک حجرے اور ان میں گھٹے اور بھینچے ہوئے سینے، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اور جذباتِ نفرت و حقارت کے آئینہ دار پژمردہ و نفسردہ چہرے ایک ایک کر کے آنکھوں کے سامنے آتے چلے گئے کیسا صحیح تھا یہ تجزیہ اور کیسی برجستہ تھی یہ تصویر ــــ مقالہ فکر اور زبان دونوں اعتبار سے اُس داد کا یقیناً مستحق تھا جو سامعین کی طرف سے پیش کی گئی۔

محترمہ مس زاہدہ منظور نے تو یہ کہا کہ طلوعِ اسلام کی فکر کے لئے فضا سازگار نہیں لیکن ان کے خالہ زاد بھائی ــــ جاوید رحیم ــــ نے کہا کہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ قوم ذمہ داری سے فرار کی راہیں تلاش کرنے کی عادی ہو چکی ہے۔ اور انہوں نے جب فرار کی ان راہوں کی نشاندہی کی تو نظر آیا کہ فی الواقعہ ہمارے معاشرہ میں کن کن جھاڑیوں کے پیچھے چور چھپے بیٹھے ہیں۔ حیرت تھی کہ انجینئرنگ کالج کے اس نوجوان طالب علم کی نگاہیں کس قدر دوررس واقع ہوئی ہیں ــــ اور کیوں نہ ہوں علامہ آئی ٹکرانے کی فضا میں پرورش یافتہ نوجوان کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔

جاوید رحیم صاحب کے مقالہ کے بعد، پرویز صاحب پھر مائیک پر آئے اور کہا کہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

لیکن ہماری ایک طاہرہ بیٹی کا کہنا ہے کہ بندۂ مومن کے زوال کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس زمانے میں حق کی آواز کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بے زری (معاشی مسئلہ) ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی دلیل اور ثبوت کیا ہے تو اس نے کہا کہ یہ میں خود مائیک پر آکر بتاؤں گی۔ چنانچہ اس کے بعد وہ طاہرہ بیٹی —— ڈاکٹر مس رشیدہ مائیک پر آئیں اور انہوں نے بتایا کہ ایک فرد کا روٹی کے لئے دوسرے فرد کا محتاج ہونا کس طرح اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ روٹی کا مسئلہ یوں تو ہر ایک کے لئے جانگداز ہوتا ہے لیکن ہمارے معاشرہ میں عورتیں بیچاری اس کی سب سے زیادہ شکار رہتی ہیں۔ جب ایک لڑکی اور لڑکے کو، خیالات کے تضاد کے باوجود، رشتۂ مناکحت میں جکڑ دیا جاتا ہے تو چند دنوں کے بعد خدائے حقیقی اور خدائے مجازی میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ خدائے حقیقی تو بیوی کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے لیکن خدائے مجازی ہر وقت اس کے سر پر سوار۔ اس کشمکش میں، بالآخر فتح خدائے مجازی کی ہوتی ہے کیونکہ وہ "ان داتا" ہوتا ہے ——

یہ کچھ انہوں نے کچھ ایسے جذب و اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں کہا کہ سینکڑوں "مجازی خداؤں" کی پلکیں بھی نمناک ہو گئیں۔

اب آخر میں، اس کاروانِ فکر و نظر کے میرِ کارواں کی باری تھی۔ اگرچہ اس میرِ کارواں کی شخصیت ہر ایک کی جانی پہچانی تھی لیکن پرویز صاحب نے ان کے تعارف کے سلسلہ میں بڑی دلچسپ بات بتائی۔ انہوں نے کہا، کوئی سات آٹھ سال ادھر کا ذکر ہے، میں ایک مرتبہ کراچی سے لاہور آیا تو بھائی انور اور بہن حمیدہ نے —— جنہیں قرآنی فکر سے شدید لگاؤ ہے —— مجھے کھانے پر بلایا۔ میں ان کے ہاں گیا ہر ایک کی خیر خیریت پوچھی۔ اور دریافت کیا کہ ان کی بڑی بچی کہاں ہے۔ عزیزہ بہن نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ بھائی جان! کیا بتاؤں۔ آپ کی بھتیجی ماشاءاللہ! بڑی ذہین اور نہایت عمدہ صلاحیتوں کی مالک ہے۔ اعلٰے طریق پر ایم۔ اے کیا ہے اس سے ہماری بڑی توقعات وابستہ ہیں لیکن اسے مذہب کے نام سے چڑ پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے آج سنا کہ گھر میں کوئی ایسا مہمان آرہا ہے جو ہر وقت خدا۔ رسول کا ذکر کرتا رہتا ہے تو وہ شام ہی سے اپنی کسی سہیلی کے ہاں چلی گئی ہے یہ کہتے کہتے عزیزہ بہن کی آواز بھرا گئی۔

اور یہی بچی اب قرآنی فکر کے اس قافلہ کی میرِ کارواں ہے۔ وہ مذہب گزیدہ تھی۔ جب دین اس کے سامنے آیا تو وہ جس شدت سے مُلّا کے مذہب سے دور بھاگی تھی اسی شدت سے دین کی گرویدہ ہو گئی۔ دین کی طرف اس کی شدتِ شوق کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کی شروع سے تعلیم انگریزی زبان میں ہوئی تھی

جس کی وجہ سے اُردو، حروف شناسی سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی لیکن میری تمام کتابیں اُردو میں تھیں ——— اور اُردو بھی میری اُردو ——— یہ کرتی یہ تھی کہ اُردو — انگلش ڈکشنری سامنے رکھ لیتی اور ایک ایک مشکل لفظ کو ڈکشنری میں دیکھ کر مطلب سمجھتی۔ اس طرح اس نے میری تمام کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اور انہیں اس طرح جذب کر لیا کہ اسے اُبھرنے والی نسل کے قرآنی حلقے کے میر کارواں ہونے کا حق حاصل ہو گیا۔ یہ ہے ہماری طاہرہ بیٹی ——— شمیم انور سلمہا — جو آپ کو بتائے گی کہ طلوعِ اسلام کی آواز کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ کیا ہے۔

محترمہ مس شمیم انور ـ لیکچرر کنیرڈ کالج لاہور۔ مائیک پر آئیں اور فکر کی بلندی اور نظر کی گہرائی سے اس طرح واقعات کا جائزہ لیا کہ ہر قلبِ سلیم اس اعتراف پر مجبور تھا کہ ——— میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا۔ تفصیل اس اجمال کی آپ چند صفحات بعد ان کے مقالہ میں دیکھیں گے۔

اس مقالہ پر اس فکر انگیز اور حقیقت کشا مذاکرہ کا خاتمہ ہوا اور مجلس نمازِ مغرب کے لئے عارضی طور پر منتشر ہو گئی۔ اجتماعات کا عام انداز یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے وہ کچھ وقت کے لئے منتشر کر دیئے جائیں تو پھر دوبارہ وہ اجتماع اُسی انداز سے نہیں جمتا۔ لیکن طلوعِ اسلام کے اجتماعات کا انداز اس سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ مجمع منتشر ہوا تو دوبارہ نشست کے وقت سے پہلے ہی پھر پنڈال اسی طرح بھرا ہوا تھا ——— ان مناظر کو دیکھ کر سارا سرِ نیاز بارگاہِ ربّ العزت میں قدم قدم پر جھک جاتا ہے کہ اس نے اپنے ان بے سرو سامان بندوں کی مساعی کو کس قدر حسنِ التفات سے نوازا ہے۔ یہ سب قرآن کی عظمت و صداقت کے تصدق ہے۔ فالحمد للّٰہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً۔

دوبارہ نشست میں پروگرام کے لحاظ سے، لیڈی میکلیگن کالج کی پروفیسر محترمہ سعیدہ اختر نے اپنے ان تاثرات کو پیش کرنا تھا جنہیں انہوں نے اپنے امریکہ کے قیام کے دوران میں حیطۂ قلب و دماغ میں جمع کیا اور قرآنی فکر کی روشنی میں جن کا تجزیہ کیا۔ لیکن ان سے پہلے ، سلمیٰ اور تجمّہ دو بچیاں سامنے آئیں۔ اور انہوں نے ایسے سیدھے سادے مگر بے تکلف لیکن اثر و جذب میں ڈوبے ہوئے انداز میں اپنے تاثرات کو پیش کیا کہ خود فضا "واہ — اور — آہ" کی ایک داستان مسلسل بن گئی ——— کیا حسین تھا یہ منظر اور کیسی دلکش تھی یہ معصوم فضا۔ ان تقاریر سے متاثر ہو کر، ایک قرآنی بزرگ نے ان بچیوں کو پچاس روپے انعام میں دیئے جسے انہوں نے اُسی وقت اپنی طرف سے کالج فنڈ میں بطور عطیہ پیش کر دیا۔ کس قدر قابلِ رشک تھا یہ ایثار، اُبھرنے والی پود کی ان ترجمانوں کا!

اس کے بعد محترمہ سعیدہ اختر مائیک پر تشریف لائیں — وہی جانی پہچانی آواز ———

وہی بے تکلفانہ انداز ــــــــ وہی کرختگی میں ڈھلی ہوئی، قلعہ معلےٰ کی زبان۔ وہی چھوٹے چھوٹے فقروں میں کہیں تنقید کے نشتر، کہیں تحسین کے پھول۔ یہ تاثرات اس حقیقت کے شاہد تھے کہ جب قرآن کی مستقل اقدار سامنے ہوں، تو پھر نگہ دوربیں کس قدر مشرق و مغرب کی وادیوں میں، پھولوں اور کانٹوں میں تمیز کرتی، بے نیازانہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ محترمہ موصوفہ کا مقالہ، اپنی امتیازات کا بصیرت افروز مرقع تھا۔

۱۴ نومبر ــــــ مجلسِ استفسارات

۱۴ نومبر کی شب کی نشست مجلس استفسارات کے انداز میں تھی۔ زندگی کے عملی مسائل سے متعلق اہم سوالات اور مفکرِ قرآن کی طرف سے باری باری ہر اہم سوال کا جواب قرآن کریم کی روشنی میں۔ سوالات تحریری صورت میں آغاز اجلاس سے قبل ہی جمع کر لئے گئے تھے اور کچھ ساتھ ہی ساتھ موصول ہوتے رہے۔ سوالات کا پلندہ ہاتھوں میں لئے پرویز صاحب نے اپنی مخصوص نشست سنبھالی اور اپنے مختصر سے خطاب سے مجلس کا آغاز کیا۔ اس خطاب میں انہوں نے واضح کیا کہ ان کا تعلق کسی فرقے سے نہیں۔ وہ قرآن کریم کی روشنی میں زندگی کے مسائل پر غور کرتے ہیں اور اسی روشنی میں، اپنی بصیرت کے مطابق سوالات کا جواب دیں گے۔

اس دفعہ مجلسِ استفسارات کی یہ خصوصیت رہی کہ سطحی نوعیت کے سوالات بہت ہی کم بلکہ برائے نام تھے۔ زیادہ تر سوالات بلند علمی سطح اور حقیقت پسندی پر مبنی تھے۔ اور اس سے واضح ہوتا تھا کہ اس مجلس کی علمی سطح پہلے سے کہیں بلند تر ہوتی جا رہی ہے۔

لاؤڈ سپیکر کی اجازت نو بجے شب تک تھی۔ چنانچہ کم و بیش ڈھائی گھنٹے تک مجلس وجہ شادابیٔ قلب و نظر بنی رہی۔ مفکرِ قرآن نے ایک ایک سوال کا جواب بڑی وضاحت اور مخصوص شگفتگی کے ساتھ دیا۔ علم و بصیرت کی یہ جوئے سلسبیل نو بجے شب تک رواں دواں رہی۔ مجلس میں موافق اور مخالف ہر طبقہ کے حضرات شریک تھے لیکن مفکرِ قرآن کے لبوں سے جب سوال کا نکھرا نکھرا جواب ابھر کر سامنے آتا تو چاروں طرف سے مرحبا اور تحسین و آفریں کی صدائیں بے ساختہ بلند ہونے لگتیں۔ قرآن کے ایک عظیم طالب علم کی عظمت کی اس سے بڑھ کر روشن دلیل بھلا اور کیا ہوگی کہ مخالف بھی وارفتہ وار خراجِ تحسین پیش کریں۔ ۹ بجے شب جب لاؤڈ سپیکر کی پابندی کی بنا پر مجلس کے خاتمہ کا اعلان ہوا تو پوری مجلس مرجھا کر رہ گئی۔ سب چاہتے تھے کہ یہ سلسلۂ علم و بصیرت

ختم نہ ہونے پائے۔ لیکن مجلس کو بالآخر ختم ہونا تھا اور وہ ختم ہو گئی۔ تمام حاضرین دلوں میں ایک حسرت لئے آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے۔ اور جب اجلاس کا خاتمہ ہوا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وقت کی پابندی نے ایک سہانے خواب کا سلسلۂ جان نواز توڑ کر رکھ دیا۔

۱۵۔ نومبر ــــ آخری کھلا اجلاس

۱۵۔ نومبر (اتوار) کی صبح کو ٹھیک ۹ بجے کنونشن کا آخری کھلا اجلاس ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کی صدارت میں شروع ہوا۔ مرزا محمد خلیل صاحب کی تلاوت کلام پاک اور نذیر فاروقی صاحب کی نظم کے بعد راجہ محمد اکرم ایڈووکیٹ نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ مقالہ کا عنوان تھا۔ وقت کی اہم ضرورت۔ محترم راجہ صاحب نے صبح ہی صبح بڑی جلدی میں یہ قلم برداشتہ مقالہ مرتب کیا تھا اور جس وقت انہیں دعوت خطاب دی گئی اس وقت بھی وہ شاید اس کی آخری سطور ترتیب دے رہے تھے۔ وہ اسی طرح اپنے کاغذ سنبھالتے مائیک پر پہنچے اور مقالے کا آغاز کر دیا۔ لیکن اس طرح ارتجالاً لکھنے کے باوجود اس مقالہ میں روانی بھی تھی اور قرآنی فکر کی روشنی بھی۔ تاثیر بھی تھی اور تفہیم بھی۔ راجہ صاحب نے وقت کی اہم ضرورت کے پیش نظر اس امر پر خاص زور دیا کہ درس گاہ کا قیام ہمارا سب سے پہلا فریضہ ہونا چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر نہ قرآنی فکر اطمینان بخش طریق پر آگے چلے گی اور نہ ہی وہ آئیڈیالوجی عملاً متشکل ہو سکے گی جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا اور جو ہماری زندگی کا منتہیٰ و مقصود ہے۔ مقالہ مختصر لیکن بڑا اثر انگیز تھا۔

راجہ صاحب کے بعد ناظم ادارہ طلوعِ اسلام، طلوعِ اسلام کی قرآنی تحریک سے متعلق تعارفی فریضہ لے کر سامنے آئے۔ انہوں نے بڑی وضاحت سے اس تحریک کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور واضح کیا کہ پینتیس چالیس برس اُدھر یہ تحریک ایک فرد واحد کی آواز تھی لیکن اب پرویزؔ کسی ایک شخصیت کے مترادف نہیں بلکہ اب یہ لفظ ترجمان ہے ایک تحریک کا اور ایک دعوت انقلاب کا جو پاکستان اور بیرون پاکستان میں ہزاروں اور لاکھوں دلوں پر اثر انداز ہے۔ اب پرویزؔ کی مخالفت ملت کے ان لاکھوں سلیم بیٹوں اور طاہرہ بیٹیوں کے فکر و عمل کے لئے ایک چیلنج قرار پائے گا اور عالمگیر حلقۂ قرآنی کے ہر گوشے سے اس چیلنج کو علیٰ وجہ البصیرت قبول کیا جائیگا۔

عالمگیر انسانیت کے تقاضے اب مجبور ہیں کہ اس دعوت قرآنی کو لبیک کہیں اور وہ وقت قریب ہے جب کہ قرآنی فکر کی یہ دعوت انقلاب پاکستان کے مستقبل کی تقدیر قرار پائے گی۔ حصول پاکستان کی

تحریک میں طلوعِ اسلام کا خونِ جگر شامل رہا اور اب یہ خون رنگ لا کر رہے گا۔ اس تعارفی مقالہ سے غلط فہمیوں کے وہ بہت سے پردے چاک ہو گئے جنہیں خاص مقاصد کے ماتحت عام کیا جاتا ہے۔

پرویز صاحب کا اہم خطاب

پنڈال آخری گوشوں تک کھچا کھچ بھر پور تھا اور دس بجنا چاہتے تھے جب کہ میرِ کاروان محترم پرویز صاحب اپنے خطاب کے لئے مائیک پر تشریف لائے۔ خطاب کا عنوان تھا قانون کی حکمرانی۔ ہمارے ہاں قانون کا مفہوم بڑا محدود سا ہے اور اس سے مراد وہ عدالتی ضابطے ہیں جن کے تحت ایک عدالت کسی مقدمہ کا فیصلہ سر انجام دیتی ہے لیکن پرویز صاحب قانون کا وہ عالمگیر اور حدود فراموش تصور لے کر سامنے آئے تھے جس کے مطابق پورا سلسلۂ کائنات جاری و ساری اور ارتقا پذیر ہے۔ خدا کا ہر فیصلہ اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ خارجی کائنات میں بھی اور انسانوں کی اپنی زندگی میں بھی۔ اسی سے کائنات اور انسانی زندگی میں ایک ایسا نظامِ عدل قائم ہے۔ اس میں کسی سے ادنیٰ رو رعایت کا سوال نہیں اور نہ کسی کی خاطر کسی تبدیلی کا۔

اُنہوں نے واضح کیا کہ یہی قانون مکافاتِ عمل تھا جو انسانوں کے لئے وحی کی وساطت سے خدا نے دیا اور اس کا تصور قرآن کے اوراق میں محفوظ ہے۔ اور پھر ثابت کیا کہ انسانوں کے خود ساختہ مذاہب نے کس طرح خدا کے نظامِ عدل کے اس قانونی تصور کو ختم کر کے ذاتوں اور ورنوں کی تقسیم، بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل کی تفریق اور گناہوں کے کفارہ کے غیر قانونی تصورات رائج کئے اور عمل اور بروئے قانون اس کے نتائج کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی۔ پھر انہوں نے اسلام میں ملوکیت اور شخصی حکومت کی کارفرمائیوں کی تفصیل پیش کی جس کا اثر براہِ راست خدا کے قرآنی تصور پر پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تصور اس شہنشاہیت کے تصور میں بدل گیا جس میں نہ کسی قانون کا سوال باقی رہتا ہے اور نہ کسی اصول کا۔ قریب دو گھنٹے کا یہ خطاب کیا تھا قرآنی مندرات و مبشرات کا عجیب امتزاج تھا جو ایک طرف باطل تصورات کی بنیادوں تک کو ہلا گیا اور ——— دوسری طرف دلوں کی بستیوں کو بنا لیا۔ صدر اجلاس ڈاکٹر سید عبدالودود بھی حاضرین کے ساتھ، اس خطاب سے شدید متاثر تھے۔ اجلاس کے اختتام پر انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ اس سے قبل وہ اپنے خطاب کے سلسلے میں یہ واضح کر چکے ہیں کہ پرویز صاحب کی دعوتِ انقلاب سے ان کے قلب میں

کیا تبدیلی پیدا ہوئی۔ قرآن کی اس آواز سے زاویۂ نگاہ میں جو تبدیلی پیدا ہوئی میں اس مرقع پر اس کا بھی ذکر کر دوں گا اور وہ یہ کہ اس سے قبل جو مذہبی پیشوا اور لیڈر بڑے بڑے پہاڑ دکھائی دیتے تھے وہ اب بونے سے نظر آتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر ڈاکٹر صاحب کی آواز سوزناک ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ عام طور انسانی دعا ایک خود غرضی پر مبنی ہوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ اسی بنا پر میری خدا سے ایک ہی دعا ہے اور وہ یہ کہ خدا پرویز صاحب کو اس وقت تک ضرور زندہ رکھے جب تک کہ میں زندہ ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے لبوں پر یہ الفاظ لرز رہے تھے اور بیشتر احباب کی پلکیں آنسوؤں سے تر بتر تھیں۔ یہی "خود غرضی" ہی تو "خلوص" کا دوسرا نام ہے۔

اس خطاب کے بعد عام اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ اور حسب اعلان مختصر وقفے کے بعد اس نے نمائندگان کنونشن کے مخصوص اجلاس کی صورت اختیار کر لی۔

آئندہ سالانہ کنونشن

اس اجلاس میں سب سے پہلے آئندہ سالانہ کنونشن کے انعقاد کا مسئلہ زیر غور آیا اور باتفاق رائے سے یہ طے کر لیا گیا کہ سالانہ کنونشن اگلے سال ماہ اکتوبر میں بمقام لاہور ہو۔

سب کنونشن

سب کنونشن کے لئے راولپنڈی اور کوئٹہ کی طرف سے پیش کش ہوئی۔ اور قدرے غور و خوض کے بعد کوئٹہ کی پیش کش قبول کر لی گئی۔ چنانچہ طے پایا کہ یہ سب کنونشن کوئٹہ میں آئندہ ماہ جون کے دوران میں منعقد ہو۔

پرویز صاحب کے تبلیغی دورے

مختلف بزموں کی طرف سے پرویز صاحب کی خدمت میں اپنے اپنے ہاں تبلیغی دورے کی دعوت پیش کی گئی تھی۔ ایک طرف راولپنڈی مردان اور پشاور وغیرہ کے دورے کا سلسلہ تھا اور دوسری طرف سیالکوٹ، منٹگمری اور ملتان وغیرہ کا۔ چنانچہ یہ معاملہ پرویز صاحب پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ ہر دو سلسلوں کی دعوت قبول کرتے ہوئے جلد اپنی مصروفیتوں میں سے فراغت کی صورت پیدا کر لیں اور متعلقہ بزموں کو مقررہ تاریخوں سے مطلع فرما دیں۔

تبلیغی دوروں سے متعلق پروگرام کے بعد کالج فنڈ کے لئے مالی تعاون کے سلسلہ کا آغاز ایک بار پھر شروع ہوا اور احباب نے پھر اپنی استطاعت سے کہیں بڑھ چڑھ کر بھاری بھاری عطیات کا اعلان کیا۔ مستقل عطیوں کے علاوہ کئی احباب نے اس مشن کی تکمیل تک مسلسل ماہانہ قسطوں کی ادائیگی کے وعدے کئے۔

آنکھوں میں دردمندی، ہونٹوں پہ عذرخواہی
جانانہ وار آئی شام فراق یاراں!

میر کارواں کا الوداعی خطاب

حسن تعاون کا یہ سلسلۂ جاں نواز اختتام کو پہنچا اور کنونشن کا وہ نازک ترین مرحلہ سامنے آگیا جو میر کارواں کے الوداعی خطاب سے تکمیل پاتا ہے۔ تحریک قرآنی کے قافلہ سالار جن کے چہرے پر چار دن سے مسلسل مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں اب احباب کی جدائی کی حسرت آ[میز] کیفیت دل میں لئے ...... ایوان کے سامنے آئے اور جب انہوں نے الوداعی خطاب کا آغاز کیا تو ان کی آواز قلب و نگاہ کی لرزشوں کی ترجمان تھی۔ انہوں نے آغاز خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

پچھلے سال جب آپ احباب گلے مل مل کر رخصت ہو رہے تھے تو مجھے جگر کا یہ شعر یاد آرہا تھا کہ

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آرہا ہے۔

میں اس کنونشن کا سال بھر انتظار کرتا ہوں۔ اس قدر انتظار کے بعد آپ تشریف لاتے ہیں اور اب جو جانے لگے ہیں تو وہی کیفیت پھر مجھ پر طاری ہو رہی ہے۔ چند ماہ قبل جب میری علالت ایک نازک مرحلے سے دوچار تھی تو اس وقت دل میں یہ تمنا بار بار اُبھر رہی تھی کہ ایک بار آپ کو پھر دیکھ لوں۔ پچھلے دنوں جب میرے خلاف بدگمانیوں کی مہم کا آغاز ہوا تو مجھے اپنے بارے میں اس کا قطعاً کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ مجھے اگر خدشہ تھا تو یہ کہ اس غلط پروپیگنڈہ سے قرآن پہنچانے والے کے متعلق اگر کوئی بدگمانیاں دلوں میں پیدا ہو گئیں تو ان کا اثر خود قرآن کی آواز پر پڑے گا۔ میں اس لئے بھی آپ سے جلد ملنا چاہتا تھا کہ آپ مجھ سے مل کر معاملہ کی تہ تک پہنچ سکیں۔

جس ہجوم شوق کو دلوں میں لئے آپ کنونشن میں شریک ہوئے ہیں وہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ قرآن کا رشتہ ہی بہترین رشتہ ہے۔ خان بخت جمال خاں، خان عبدالحکیم خاں۔ چوہدری نصر اللہ خاں اور الحاج خیر محمد پراچہ جو اپنی معذوری کے باعث کنونشن میں شرکت نہیں ہو سکے ان کے خطوط بہت بڑی محرومی کا اظہار ہیں۔ میں نے یہاں ہر چہرے پر تبسم ہی تبسم پایا ہے۔

یاد رکھئے کہ آپ قرآن کے پیامبر ہیں۔ آپ کی مختصر سی جماعت اس شمع کو ہاتھوں میں لئے کھڑی ہے۔ اس لئے اپنی ذمہ داریوں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھئے۔ زمانہ مایوسی کی تاریکیوں میں کھڑا ہے اور اس روشنی کو قبول کرنے کے لئے بے قرار ہے اس لئے عزم و ہمت سے شمعِ قرآنی کو لے کر آگے بڑھئے اور اس کی روشنی کو تاریک فضاؤں میں پھیلا دیجئے۔

خدا آپ کو اپنی رحمت کے سائے میں مسرتوں سے مالا مال رکھے۔ آپ بار بار جائیں اور بار بار تشریف لائیں۔ کیونکہ

وداع و وصل جُداگانہ لذّتے دارد

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا۔

یوں یہ کاروانِ شوق، جذب و کیف اور علم و بصیرت کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے۔ واپس لوٹا۔

یوں تو طلوعِ اسلام کی ہر کنونشن سابقہ کنونشن سے زیادہ پُر رونق ہوتی چلی آ رہی ہے لیکن یہ کنونشن سابقہ تمام اجتماعات پر بازی لے گئی۔ کچھ اس غلط پروپیگنڈے کا ردِ عمل جو تحریک کو ناکام بنانے کے لئے ابھارا گیا تھا، کچھ حسنِ انتظام۔ نتیجہ یہ کہ یہ حسین و جمیل اجتماع، مسلسل چار روز تک نور و نکہت کی فضاؤں میں ڈوبا رہا۔ ہماری عام طور پر یہ حالت ہو چکی ہے کہ جہاں چار مسلمان بیٹھے وہ جھگڑا کئے بغیر اٹھتے نہیں۔ لیکن اس قرآنی برادری کا یہ عالم ہے کہ سینکڑوں کی تعداد میں احباب جمع ہوتے ہیں۔ دن رات ایک جگہ کھاتے پیتے اور رہتے سہتے ہیں لیکن کیا مجال جو کسی گوشے سے اونچی آواز تک بھی کان میں پڑ جائے۔ جس طرف نکل جایئے سلاماً سلاماً کی طمانیت بخش صدائیں فردوسِ گوش بنتی چلی جاتی ہیں۔ ہر لب خندہ ریز۔ ہر پیشانی تبسم فشاں۔ یہ ابھی قرآنی تعلیم کا محض آغاز ہے۔ جب یہ پورے طور پر دل میں گھر کر جائے تو پھر واقعی وہ منظر آنکھوں کے سامنے آ سکتا ہے جسے قرآن نے اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ سے تعبیر کیا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو اسی طرح قائم و دائم رکھے تاکہ وہ جنتی معاشرہ جس کی تشکیل اس تمام تگ و تاز کا منتہیٰ و مقصود ہے، جنت بداماں سامنے آ جائے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

قرار دادیں

(یہ سب قراردادیں کنونشن میں باتفاق رائے منظور ہوئی تھیں)

قرار داد ۱　　محرک ——— عزیز قریشی صاحب (نمائندہ بزم راولپنڈی)

ہرگاہ کہ پچھلے سال طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن میں ایک کالج و ہال تعمیر کرنے کی تجویز منظور کی گئی تھی اور اس کے لئے کچھ رقم بھی اکٹھی ہوئی تھی جو کہ اس وقت کے صدر کنونشن کمیٹی میاں عبدالخالق صاحب کے پاس بھیج دی گئی تھی اور مزید عطیات کے وعدے بھی ہوئے تھے۔

لیکن یہ کنونشن اس امر پر افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ معاملہ آگے نہ بڑھایا جا سکا۔ چونکہ یہ معاملہ نہایت ہی اہم ہے اس لئے یہ کنونشن اس امر کا شدت سے اظہار کرتی ہے کہ اس سلسلہ میں حسب ذیل اقدامات فوری طور پر کئے جائیں۔

۱۔ یہ کہ اس کام کے لئے مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جاتی ہے اور اس کمیٹی کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وعدہ شدہ رقوم کو حاصل کرے اور مزید فنڈ جمع کرنے کا بندوبست کرے۔ نیز اس کمیٹی کو یہ بھی ہدایت کی جاتی ہے کہ سابقہ جمع شدہ رقم میاں عبدالخالق صاحب سے فوری طور پر اپنی تحویل میں لے لے۔ اور میاں صاحب موصوف سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ رقم صدر کمیٹی کے حوالے کر دیں۔

۱۔ شیخ سراج الحق صاحب (صدر کمیٹی)

۲۔ مرزا محمد خلیل صاحب ممبر

۳۔ راجہ محمد اکرم صاحب ممبر

۲۔ یہ کنونشن اس کمیٹی سے یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ اس معاملے کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو بطریق احسن پورا کرے گی۔ اور میاں عبدالخالق کے، اس معاملہ میں ردِ عمل اور اپنی جدوجہد کے نتائج سے بزم ہائے طلوع اسلام کے نمائندوں کو وقتاً فوقتاً مطلع کرتے رہیں گے تاکہ وہ دیگر اراکین کو اس کی بابت اطلاع دیتے رہیں۔

قرار داد ۲　　محرک ——— میرزا محمد خلیل صاحب

تحریک طلوع اسلام کو عوام تک پہنچانے اور اسے تمام چھوٹے بڑے مقامات میں فروغ دینے کے لئے۔ اہم موضوعات پر شائع شدہ پمفلٹس کی تقسیم بزم ہائے طلوع اسلام کے حلقوں میں بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے

پیش نظر یہ کنونشن قرارداد پیش کرتی ہے کہ

تمام بزمہائے طلوع اسلام پمفلٹس کی کثیر تعداد میں نشر و اشاعت اور تقسیم کے سلسلے میں ادارہ طلوع اسلام لاہور کے ساتھ ایک مستقل اور مسلسل رابطہ قائم کرلیں تاکہ ادارہ کو مستقل طور پر ماہ بماہ یہ معلوم ہو کہ بزموں کی ضرورت کو کماحقہٗ پورے کرنے کے لئے کس کس موضوع کے اور کتنے کتنے پمفلٹس کی ضرورت ہے جو انہیں باقاعدہ طور پر بھیج دیئے جائیں جو بزمیں پمفلٹس بذریعہ وی پی نہ لینا چاہیں وہ ادارہ کو اس مد میں ماہ بماہ اپنی رقوم پیشگی ارسال کریں تاکہ ادارہ کو ان کی نشرواشاعت اور ترسیل میں دقت نہ ہو۔

یہ قرارداد اس ترمیم کے ساتھ منظور ہوئی کہ ہر بزم اپنی آمدن کا کم از کم چوتھائی حصہ پمفلٹوں کی خرید کے لئے مختص کرے۔ اس سے زیادہ کا فیصلہ نمائندہ بزم کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔

قرارداد ۳　　محرک ــــــ عزیز قریشی صاحب۔ نمائندہ بزم راولپنڈی

تمام بزمہائے طلوع اسلام کے لئے ضروری قرار دیا جائے کہ وہ ہر سال کنونشن میں اپنی بزم کی مفصل روئیداد پیش کریں جس میں یہ بتایا جائے کہ بزم نے کتنی مرتبہ درس قرآن کیا۔ کتنے پمفلٹ بانٹے۔ کتنی کتابیں خریدیں۔ کتنی گشتی لائبریریاں بنائیں۔ بزم کو دوران سال کیا کیا دشواریاں پیش آئیں۔ کتنے ممبر بنائے گئے۔ طلوع اسلام کے کتنے خریدار بنائے۔

غرضیکہ تفصیلی رپورٹ پیش کی جائے تاکہ ہم صحیح معنوں میں اپنا محاسبہ کرسکیں۔

قرارداد ۴　　محرک ــــــ عزیز قریشی صاحب

ہرگاہ۔ تحریک طلوع اسلام کے فروغ و کامیابی کے لئے محترم پرویز صاحب کی ٹیپ شدہ تقاریر اور درس قرآن سننے کا خاطر خواہ انتظام ایک بہت ہی مؤثر ذریعہ ہے۔ اس کے پیش نظر یہ کنونشن قرارداد پیش کرتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ بزمیں اپنے ہاں ٹیپ ریکارڈر خریدنے کا فوری اہتمام کریں۔ تاکہ ادارہ انہیں ایک باقاعدہ اور مستقل پروگرام کے ماتحت محترم پرویز صاحب کا درس قرآن اور دیگر تقاریر کے ٹیپ مہیا کرنے کا انتظام کرے۔

قرارداد ۵　　محرک ــــــ حسن عباس رضوی صاحب۔ نمائندہ بزم کوئٹہ

ہرگاہ سال ۱۹۵۷ء میں منعقدشدہ کنونشن طلوع اسلام نے لغات القرآن کی طباعت کے سلسلہ میں فنڈ مہیا کرنے کی اپیل کی تھی اور اس طرح رفتہ رفتہ کل -/۲۲۶۱۴ روپے جمع ہوئے تھے۔ جو ادارہ طلوع اسلام کو بذریعہ محترم پرویز صاحب دیئے گئے تاکہ وہ اس رقم سے لغات القرآن کی طباعت کا انتظام اپنی صوابدید کے مطابق کریں۔ مذکورہ رقم احباب نے ادارہ طلوع اسلام اور محترم پرویز صاحب کے ساتھ وابستگی و عقیدت کے پیش نظر

اس اہم کام کے لئے بصد اشتیاق بطور عطیہ پیش کی تھی اور محترم پرویز صاحب کو اس رقم کا مالک بنایا گیا تھا۔

محترم پرویز صاحب نے لغات القرآن کی طباعت کے بعد از خود -/۸۴۵۲۲ روپے کی کتابیں میزان پبلیکیشنز لمیٹیڈ کے حوالے کر دی تھیں تاکہ وہ کتابیں فروخت کرنے کے بعد رقم حاصل ہو سکے۔ اس سلسلہ میں روپیہ کی بازیابی کی ذمہ داری ادارہ کی تھی۔ لیکن اس رقم میں سے ابھی تک ادارہ کو کچھ بھی واپس نہیں دیا گیا۔

یہ کنونشن قرارداد پیش کرتی ہے کہ مبلغ -/۸۴۵۲۲ روپیہ کی کتابیں جو کہ میزان پبلیکیشنز کے پاس رکھی ہیں وہ یا اگر ان میں سے کچھ کتابیں فروخت ہو چکی ہیں تو ان کی فروخت سے حاصل شدہ رقم، فوراً محترم پرویز صاحب کے حوالہ کر دی جائیں۔

محترم پرویز صاحب کو اختیار حاصل ہے کہ وہ ان کتابوں کو، یا ان کی فروخت سے حاصل شدہ رقم کو اپنی صوابدید کے مطابق تحریک طلوع اسلام کے فروغ کے لئے صرف کریں۔

۲۔ یہ کنونشن تجویز کرتی ہے کہ اس قرارداد کی نقل مینیجنگ ڈائرکٹر میزان پبلیکیشنز لاہور / کراچی کو بھیج کر ان سے تاکید اکہا جائے کہ وہ مذکورہ صدر کتابیں یا ان کی قیمت بلاتاخیر محترم پرویز صاحب کے حوالے کر دیں۔

۳۔ نیز یہ کنونشن ادارہ طلوع اسلام سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اس بارے میں جو کچھ عمل میں آئے اس سے بزم ہائے طلوع اسلام کے نمائندگان کو مطلع کرتا رہے۔

قرارداد ۶ محرک ——— صدر جلسہ احسن عباس رضوی صاحب

ہر گاہ کچھ عرصہ سے میاں عبدالخالق صاحب اور کراچی کے چند دیگر حضرات، محترم پرویز صاحب کے خلاف، جھوٹا پروپیگنڈہ کر کے، تحریک کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میاں صاحب موصوف، اور ان کے رفقاء نے اس سلسلہ میں چند چٹھیاں مختلف احباب کو، ان کے اندر بددلی پیدا کرنے کے لئے بھیجی ہیں۔

یہ اجتماع میاں صاحب اور ان کے رفقاء کی، ان تخریبی حرکات کو، افسوس کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان کے اس اقدام سے، تحریک طلوع اسلام سے وابستہ احباب کے جذبۂ احترام و عقیدت کو، جو انہیں محترم پرویز صاحب اور ان کی قرآنی فکر سے ہے، سخت ٹھیس پہنچی ہے۔

یہ اجتماع میاں صاحب اور کراچی کے اُن حضرات سے، جو ان کی ہمنوائی کرتے ہیں خواہش رکھتا ہے کہ وہ اپنی تخریبی کارروائیاں، بند کر دیں۔ یہ اجتماع محترم پرویز صاحب کا دلی احترام کرتا ہے اور اپنے دلوں میں ان کے لئے جذبۂ الفت و محبت رکھتا ہے۔ اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالےٰ انہیں صحت کے ساتھ، عمر دراز عطا کرے، تاکہ وہ اپنے مبارک قرآنی مشن کو تکمیل تک پہنچا سکیں۔

نوٹ:۔ اس قرارداد کی نقول، میاں عبدالخالق صاحب اور حافظ برکت اللہ صاحب کو بھیجی جائیں تاکہ وہ اپنے ہمنوا احباب کو، اس اجتماع کے جذبات سے مطلع کر دیں۔

قرارداد ۷ محرک ـــــ عزیز قریشی صاحب

گذشتہ دنوں محترم پرویز صاحب کی علالت اور اس علالت کے دوران اس نازک مراحل کی تفاصیل اب ہمارے علم میں آگئی ہیں۔ اس سلسلے میں محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب جنکی محبت اور دلی عقیدت مفکر قرآن کیساتھ بے مثل ہے، مساعی جمیلہ جو مفکر قرآن کی دوبارہ صحتیابی کے سلسلہ میں بروئے کار آئی تھیں ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جسکے لئے ہم درگاہ رب العزت میں جس قدر بھی شکریہ ادا کریں کم ہے۔ یہ اجتماع اس بارے میں مندرجہ ذیل قرارداد پیش کرتا ہے

۱. کنونشن میں شامل ہونے والے تمام اراکین بصمیم قلب محترم ڈاکٹر سید عبدالودود کو ان کی مبارک اور بروقت خدمات اور اعانت کے لئے شکریہ پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔

۲. کنونشن کے اراکین مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کو ان کی اس دیرینہ علالت اور اس کے بعد آپریشن کے ذریعہ صحتیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہیں کہ وہ موصوف کو لمبی عمر عطا فرمائے تاکہ وہ اپنی زندگی کے سب سے اہم مشن یعنی قرآنی نظام ربوبیت کی تکمیل اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

قرارداد ۸ محرک ـــــ حسن عباس رضوی صاحب

طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس محترم شیخ محمد یوسف صاحب کا بخلوص قلب شکر گذار ہے کہ انہوں نے کرمفرمائی اور فیاضی سے کام لیتے ہوئے نمائندگان کنونشن کے قیام کے لئے اپنے بنگلہ کا ایک حصہ کنونشن کمیٹی کی تحویل میں دے دیا اور اس طرح ان کے لئے قابل قدر سہولیت مہیا فرمائی۔

نوٹ:۔ اس قرارداد کی ایک نقل محترم موصوف کی خدمت میں بھیجی جائے۔

قرارداد ۹ محرک ـــــ حسن عباس رضوی صاحب

طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس محترم شیخ سراج الحق صاحب کا شکر گذار ہے کہ انہوں نے کنونشن کے پنڈال طعام گاہ اور رہائشی ضروریات کے لئے اپنی قیامگاہ کو حسب ضرورت کنونشن کمیٹی اور نمائندگان کنونشن کے استعمال کے لئے کمیٹی کے سپرد کر دیا۔

نوٹ:۔ اس قرارداد کی ایک نقل شیخ صاحب موصوف کی خدمات میں بھیجی جائے

قرارداد ۱۰ (محرک، حسن عباس رضوی صاحب) طلوع اسلام کنونشن کا یہ سالانہ اجلاس بزم طلوع اسلام لاہور کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ اس نے ملک کے طول و عرض سے آنیوالے نمائندگان کنونشن کے قیام و طعام کے سلسلے میں ممکن بہترین انتظامات مہیا کرنیکی کامیاب کوشش کی۔

قرارداد ۱۱ محرک ـــــ میرزا محمد خلیل صاحب

بزم طلوع اسلام لاہور تمام شرکائے کنونشن کی شکر گذار ہے کہ انہوں نے موسمی شدائد اور دیگر رکاوٹوں کے باوجود کنونشن میں شرکت کی اور اسے اس طرح سے کامیاب بنایا۔

صفدر سلیمی

رپورٹ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور
(طلوعِ اسلام کنونشن سنہ ۱۹۶۴ء)

رُفقائے محترم! اسلام و رحمت

آٹھ سال قبل کم و بیش، انہی تاریخوں میں، پہلی طلوعِ اسلام کنونشن کے نام پر، دعوتِ قرآنی کا پرچم بلند کرتے ہوئے، ہم نے منظم طور پر اپنے اجتماعی سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہماری موجودہ کنونشن اس سفر کا آٹھواں پڑاؤ ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایک بار پھر ہم نے سرِ راہ رک کر اپنے طے شدہ سفر کا جائزہ لینے، اپنی کمزوریوں کو جانچنے اور مستقبل کے لئے کچھ تعمیری منصوبے طے کرنے کی صورت پیدا کی ہے۔ اقبالؔ نے کہا تھا کہ

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
رکھتی ہے جو ہر گھڑی اپنے عمل کا حساب

ہم ایک قوم نہ سہی، ایک عظیم الشان ملّت کے اس کاروانِ شوق کے طائرانِ پیش رس ضرور ہیں، جو شرفِ انسانیت کی بازآفرینی کے لئے قرآن کی دعوتِ انقلاب کو جہانگیر اور عالم آرا دیکھنے کا آرزومند ہے۔

برادرانِ عزیز! اس سے قبل ہماری سابقہ کنونشنز میں ادارہ کی رپورٹ کا آغاز عام طور پر بزموں کے حسنِ عمل کی تحسین یا ان کی کمزوریوں کی نشاندہی سے کیا جاتا تھا۔ لیکن اس بار ہم نے ضروری سمجھا کہ آپ احباب کے مشفقانہ گلوں اور شکووں کے پیشِ نظر خود ادارہ اپنے آپ کو آپ کے سامنے پیش کر دے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس عرصہ میں ہم آپ احباب کی ان توقعات کو پورا نہیں کر سکے جو آپ نے تحریکِ قرآنی کی سرپرستی

سُست روی کے اسباب

کی بنا پر ادارہ سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ ہم اپنے سلسلۂ نشر و اشاعت کی اس رفتار کو بھی قائم نہیں رکھ سکے جو جلد از جلد منزل تک پہنچنے کے لئے ہمارا فریضہ قرار پائی تھی۔ لیکن آپ کو شاید پوری طرح معلوم نہیں کہ ہمارے اس تساہل اور کم رفتاری میں سب سے زیادہ دخل ہماری داخلی مجبوریوں اور معذوریوں کو بھی تھا۔

آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ پہلے دن سے ہماری اس قرآنی تحریک کو نہ کسی کی مالی سرپرستی حاصل ہے۔ نہ اسے کوئی خارجی ذرائع اور وسائل میسر ہیں اور نہ یہاں چندہ بازی کی کوئی رسم و راہ موجود ہے۔ پہلے ہی سے صورت یہ چلی آرہی تھی کہ میر کارواں محترم پرویز صاحب خود اپنی جیب سے طباعت و اشاعت کا ایک سلسلہ چلائے چلے آرہے تھے یہ تمام بوجھ انہوں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ ان کی کتابوں کی اشاعت و فروخت سے کچھ بچت ہوتی تھی اور اس سے ادارہ کے اخراجات اور طلوعِ اسلام کے خسارے کو پورا کرنے کی صورت چلی آرہی تھی

۱۹۶۱ء میں میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مفکرِ قرآن کا جو قیمتی وقت اور توانائیاں کتابوں کی طباعت و اشاعت میں صرف ہو رہی ہیں وہ قرآنی فکر کے نشو و ارتقاء کے کام آسکیں اور کاروباری نوعیت کے اس دردِ سر سے فراغت پاکر وہ اپنی علمی و فکری صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں۔ دوسرے یہ کہ انفرادی کوششوں کے بجائے اجتماعی کوشش سے ان کتابوں کی طباعت اور اشاعت کا سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ مقصد پورا نہ ہوا۔ بخلاف اس کے

میزان لمیٹڈ

ہوا یہ کہ میزان نے شرکت کی بنا پر ہمیں اپنا تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ لٹریچر اس کے سپرد کرنا پڑا۔ اس سے ادارہ کے اخراجات اور طلوعِ اسلام کے خسارے کی صورت تو بدستور وبالِ جان بنی رہی لیکن ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ادارہ کی مطبوعات سے جو آمدن حاصل ہوتی تھی اس کا سلسلہ یکدم ختم ہو کر رہ گیا۔ شاید آپکو ادارہ طلوعِ اسلام کے مسلسل خسارے کا کوئی صحیح اندازہ نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مرحلہ پر قدرے رک کر اس سلسلے میں، زیادہ نہیں تو گذشتہ چار سال کا مختصر سا نقشہ آپ کے رکھدوں۔ سنئے

۱۹۶۱ء ———	کل خرچ -	۲۶۰۸۳ - ۳۸
	کل آمد -	۱۷۲۴۰ - ۸۲
	خسارہ -	۸۸۴۲ - ۵۶

۱۹۶۲ء ——— خسارہ — ۷۸۵۴-۹۱

۱۹۶۳ء ——— خسارہ — ۶۸۵۹-۶۸

۱۹۶۴ء تا ۳۱ اکتوبر — خسارہ — ۵۴۶۴-۴۴

پرویز صاحب کی مطبوعات سے رسالہ کا یہ خسارہ اور ادارہ کے دیگر اخراجات پورے ہو رہے تھے لیکن میزان پبلیکیشنز کے قیام کے بعد یہ صورت باقی نہ رہی۔ میزان کے قیام کا مقصد پرویز صاحب کی خارجی پریشانیوں کو ختم کرنا تھا لیکن نتیجہ اس کے برعکس سامنے آیا اور مفکر قرآن کی پریشانیوں میں بیش از بیش اضافہ ہوتا چلا گیا

پریشانیاں

ان کی مطبوعات ہی لے دے کے ان کا تمام سرمایہ تھا۔ جو یوں منجمد ہو کر رہ گیا۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس ناخوشگوار اور پریشان کن صورت حال میں ایک مفکر کے ساتھ کیا کچھ بیتتی رہی اور آئے دن کے ان اخراجات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انہیں کس قدر کڑوے گھونٹ پینے پڑے اور اس وقت تک ان کی کیا کیفیت چلی آ رہی ہے۔

ناظم ادارہ کی حیثیت سے مجھے محترم پرویز صاحب کے بہت قریب ہونے کے مواقع حاصل ہیں۔ میری نگاہیں ان کی شبانہ روز پریشانیوں کو برابر بھانپتی رہیں۔ اور اس سے ان کی صحت جس قدر متاثر ہو رہی تھی میں اس سے بے خبر نہیں تھا۔

میزان میں جو کچھ ہوا اور جس طرح پرویز صاحب اور ادارہ کے تعلقات اس سے ختم ہوئے میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ یہ ایک تلخ سی داستان ہے جسے دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

حضرات! اس ساری تفصیل کا مقصد آپ سے کسی مالی امداد کی اپیل قطعاً نہیں۔ کہیں اس سے یہ گمان نہ ہو کہ ادارہ اس صورت حال کا رونا رو کر آپ سے کوئی مطالبہ کرنا چاہتا ہے۔ ادارہ کے سابقہ کردار کو پیش نظر رکھ کر میں اس ریخیدہ صورت حاصل کا تذکرہ چھیڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے خطرہ تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ادارہ کے بارے میں آپ کے مخلصانہ گلوں شکووں کا ازالہ ممکن نہیں ہوگا اور اس کے خلاف تساہل، سست روی اور بے پرواہی کے الزامات کی صفائی سامنے نہ آ سکے گی۔

ادارہ کی مشکلات کا سلسلہ اسی وضاحت پر ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد پرویز صاحب کی جانکاہ علالت اور اپریشنوں کے جو نازک مرحلے سامنے آئے وہ ادارے کا سکون و اطمینان زیر و زبر کرنے کے لئے کچھ کم نہیں تھے۔

پرویز صاحب کی علالت

اس دوران میں ایک ایسا کڑا وقت بھی سامنے آ گیا تھا جب کہ ہمارے مایۂ ناز میر کارواں کی زندگی موت کے چنگل میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔ قرآنی تحریک کا دھڑکتا ہوا دل مہیب خطرے سے دوچار تھا۔ تحریک قرآنی اور اس کے طائر پیش رس کو

شیدائی ڈاکٹر سید عبدالودود جن کو مضبوط دل رگ جان پر نشتر چلاتے بھی کبھی نہیں دھڑکا، ٹیلیفون کے قریب سر لٹکائے بے حس و حرکت اور خاموش بیٹھے تھے۔ احباب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور دلوں کی دھڑکنوں سے بیتاب دعائیں اُبھر اُبھر کر عرشِ عظیم سے ٹکرا رہی تھیں۔

رفقائے عزیز! میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اس دن ہم نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ ایک قیمتی اور نایاب مرد کے چھن جانے سے ہم کیا کچھ کھو سکتے ہیں۔ اور دعوتِ قرآنی کا ابھرتا ہوا آفتاب کن تاریکیوں میں کھو جائے گا۔ یہ مبدائے فیض کی کرم گستری تھی کہ دلوں کی پکار کو شرفِ ایجاب نصیب ہوا اور غروبِ آفتاب کے بعد آہستہ آہستہ یہ ہیجان خیز خطرہ ٹلنا شروع ہوا اور پرویز صاحب ہمیں واپس مل گئے۔ ان کی صحت کی بحالی میں دو ماہ سے زیادہ وقت لگ گیا۔ اس دوران میں بڑے ضروری کام رکے پڑے رہے اور بہت سے اہم منصوبے التواء کا شکار ہو کر رہ گئے۔ لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ان نازک مرحلوں سے گزر کر پرویز صاحب نے بالآخر پھر وہ میز کرسی سنبھال لی جو سالہا سال سے ان کی عالمگیر دعوتِ قرآنی کا اشاعتی مرکز چلی آ رہی ہے۔

میرے دوست تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ پرویز صاحب کے اس طویل اور جانکاہ سلسلے کا تعلق تو کسی طبیعی عارضہ سے ہی ہو لیکن جو کچھ میری نگاہوں نے قریب سے دیکھا ہے اسے پیش نظر رکھتے ہوئے مجھے یہ عرض کرنا ہی ہوگا کہ اس سلسلۂ علالت میں محترم پرویز صاحب کی دماغی پریشانیوں کو بھی بڑا دخل حاصل تھا۔ یہ پریشانیاں اندر ہی اندر ان کی توانائیوں کو مضمحل کئے چلی آ رہی تھیں۔

لٹریچر کی اشاعت

برادرانِ محترم! سوچیے کہ ان حالات میں اگر ہم آپ کی توقعات کو کما حقہٗ پورا کرنے کے قابل نہ ہو سکے اور لٹریچر کا کام بڑی حد تک رُکا رہا تو یہ کن مجبوریوں اور معذوریوں کی بنا پر تھا اور ہم ایک مدت سے کیوں بے چارگی میں مبتلا رہے۔ ان مجبوریوں کے باوجود ہم نے آپ کو مایوس نہیں کیا۔ اس بے چارگی میں بھی ادارہ نے نہ صرف کئی اہم پمفلٹ شائع کئے بلکہ پرویز صاحب کی بعض ایسی کتب بھی جن کا انتظار کئی سالوں سے برابر ہو رہا تھا۔ ان کتابوں میں "سلیم" "قرآنی فیصلے" (دوسرے ایڈیشنوں میں) اور "اسلام کیا ہے؟" (دوسرے اور تیسرے ایڈیشنوں میں)۔ ان کے علاوہ ... مجموعہ پریس میں جانے کے لئے تیار ہے۔ یہ کچھ ادارہ نے گذشتہ چند ماہ کے عرصہ میں کیا ہے۔ پمفلٹوں میں جو اس دوران میں شائع کئے گئے "اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں" "پاکستان کس نے بنایا؟" "جماعت اسلامی خود اپنے آئینے میں" "مولانا مودودی اور جمہوریت" "معرکۂ دین و وطن" آپ کے سامنے آ چکے ہیں۔ کم و بیش چھ اہم پمفلٹوں کو اس کنونشن پر ہزاروں کی تعداد میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے اور وہ کنونشن کے سٹال پر موجود ہیں۔ یہ پمفلٹ چھپتے رہے یہ کتابیں شائع ہوتی رہیں۔ لیکن آپ نہیں جانتے کہ ہم اس رفتار سے مطمئن ہرگز نہ تھے۔ اور اب

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہم گویا پھر اسی مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے قیامِ پاکستان کے بعد ہم نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ بہرحال ہم کچھ کڑے مرحلے طے کر آئے ہیں۔ محترم پرویز صاحب نے اپنی صحت کی بحالی کو مشیت کا کوئی اہم مقصد قرار دیا ہے اور بحالیٔ صحت کے شکرانے کے طور پر انہوں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ اپنی سعی و کاوش کی رفتار تیز تر کر دیں اور مشیت کے پروگرام کی بجا آوری میں جو کچھ ممکن ہو کر گذریں۔ دعا کیجئے کہ ان کا یہ عزمِ صمیم حاصل تکمیل کو پہنچ جائے۔

آپ اس سلسلے میں اگر کسی حسنِ تعاون کا ثبوت مہیا کر سکتے ہیں تو اس کی کامیاب صورت یہی ہے کہ ادارے کی طرف سے جو کتب اور پمفلٹ شائع ہو رہے ہیں ان کی اشاعت میں زیادہ سے زیادہ ہمت اور حوصلے کا ثبوت دیجئے۔ طلوعِ اسلام کی اشاعت کو تیزی سے بڑھایئے۔ اس سے ایک طرف ادارہ کی مشکلات اور پرویز صاحب کی پریشانیوں کا خاتمہ ہوگا اور دوسری جانب قرآنی فکر کی روشنی زیادہ سے زیادہ پھیلتی چلی جائے گی۔

بزمِ لاہور کی سرگرمیاں

آپ احباب کے لئے یہ اطلاع اطمینان و مسرت کا باعث ہوگی کہ حالات کی اس نامساعدت میں، جو آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے، لاہور کی بزم نے خاطر خواہ سرگرمیوں کا ثبوت دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بزم میں ایک نئی زندگی عود کر آئی ہے اور ناگوار صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے وہ منظم طور پر عملی میدان میں آگئی ہے۔ بزمِ لاہور کی حسنِ کارکردگی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اگست ۶۳ء سے لے کر گذشتہ اگست تک ایک سال میں بزم نے مختلف قومی تقریبات پر پرویز صاحب کے خطاب کے لئے چھ پبلک اجتماعات کا وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں اور ایک کا برٹش انسٹی ٹیوٹ ہال میں اہتمام کیا۔ علاوہ بریں جشنِ نزولِ قرآن اور جشنِ عید میلادالنبیؐ کے سلسلے میں دو اجتماعات محترم پرویز صاحب کی قیام گاہ پر ہوئے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۴ اگست	وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال	موضوع "اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں"
۱۱ ستمبر	وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال	" "پاکستان کس نے بنایا؟"
۲۰ اکتوبر	" " " " "	" "ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟"
۲۵ دسمبر	" " " " "	" "مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"
۹ فروری	" " " " "	" "عید کیوں منائی جاتی ہے؟"
۱۶ فروری	قیام گاہ پرویز صاحب	" "جشنِ نزولِ قرآن"
۱۲ اپریل	برٹش انسٹی ٹیوٹ ہال	" "آدم کی کہانی اقبال کی زبانی"
۲۲ جولائی	قیام گاہ پرویز صاحب	" "جشنِ عید میلادالنبیؐ"
۱۴ اگست	وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال	" "ہم نے پاکستان مانگا کیوں تھا"

بزم کے احباب نے پرویز صاحب کی علالت اور اپریشنوں کے دوران میں بھی انہیں ہر ممکن سہولت مہیا کرنے کی پوری پوری سعی و کاوش کی۔ اپریشن کے دوران میں جب پرویز صاحب کے لئے خون مہیا کرنے کا مرحلہ آیا تو ہر ایک کی شدت آرزو یہی تھی کہ اس کا خون ان کے کام آسکے۔ اس پیشکش میں انہوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بیتابی کا اظہار کیا۔

نئی بزمیں

گذشتہ کنونشن کے بعد ڈھاکہ اور اسلام آباد میں نئی بزموں کا قیام عمل میں آیا اور ملتان کی بزم کا عرصہ کے بعد از سرِ نو احیاء ہوا۔ ڈھاکہ کی بزم اگست ۱۹۶۳ء میں متشکل ہوئی اور اپنے نمائندہ محترم اے حلیم صاحب کی قیادت میں اس نے جو کام گذشتہ ایک سال میں کیا وہ ہم سب کے لئے باعث فخر و مسرت ہے۔ محترم اے۔ حلیم صاحب نے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں مشرقی پاکستان کے جرائد اور بالخصوص وہاں کے طلباء کے انگریزی اور بنگلہ جرائد میں بڑے اہم مضامین شائع کرائے۔ ان مضامین کی اشاعت سے طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کا مشرقی پاکستان کی نئی نسل میں بالخصوص چرچا ہوا اور انہیں بعید پسند کیا گیا۔ ڈھاکہ کی اس سرگرم بزم کے قیام اور وہاں کے احباب کی جدوجہد سے محترم پرویز صاحب کے خطابات اور درسِ قرآن سنانے کا بھی اہتمام کیا گیا۔ ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات کی ایجنسی بھی قائم ہو گئی اور اس طرح بزم کے قیام سے مشرقی پاکستان کے علمی حلقے طلوعِ اسلام کی دعوتِ قرآنی سے خاصے متعارف ہو رہے ہیں۔ ان احباب کی کوششوں سے ادارہ کی مالی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے طلوعِ اسلام میں اشاعت کے لئے اشتہارات بھیجنے کا بھی اہتمام کیا گیا اور اس طرح اس بزم نے اپنے حسنِ کارکردگی سے اس تھوڑی سی مدت میں ایسی قابلِ قدر مثالیں پیش کیں جو دیگر بزموں کے لئے باعث تقلید ہیں۔ ادارہ اُمید کرتا ہے کہ محترم اے حلیم اور ان کے سرگرمِ عمل رُفقاء کی سعی و کاوش سے مشرقی پاکستان کی فضا میں قرآنی فکر کے چراغ روشن ہوتے چلے جائیں گے۔

بزمِ کوئٹہ

بزم ڈھاکہ کے بعد بزم کوئٹہ کی باری آتی ہے یہ بزم بھی محترم حسن عباس رضوی محترم ملک غلام کبریا خان اور دیگر احباب کی سرکردگی میں منظم طور پر کام کر رہی ہے۔ بزم ڈھاکہ کی طرح اس بزم کے ارکان اپنی مجلس میں قرآنی فکر کی روشنی میں اظہارِ خیال بھی کرتے ہیں اور درسِ قرآن کا سلسلہ بھی بذریعہ ٹیپ جاری ہے۔ ان اجلاسہائے بزم میں کوئٹہ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ شریک ہوتا ہے۔ اور یہ ان کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اس شہر کے علمی حلقوں میں طلوعِ اسلام کے پیغام کو بڑی اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔

بزمِ لائلپور

بزم لائلپور نے بھی مدت کے بعد ایک حسین انگڑائی لی ہے اور ہمارے دیرینہ رفیق محترم محمد اکرم خان صاحب کی مساعیِ جمیلہ کے تصدق اس کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑنے لگا ہے۔

بزمِ راولپنڈی

حسبِ سابق اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ وہاں ٹیپ کے ذریعے درس کا سلسلہ باقاعدہ جاری ہے۔ مردان کے احباب بھی بزموں کے جذبِ محبت ہیں: کچھ عمر رسیدہ سے ہو رہے ہیں لیکن اس کے باوجود جوان ہمت ہیں۔ کبیر والا میں محترم عبدالحی اور ان کے رفقاء پورے نظم و ضبط سے مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ سیالکوٹ میں اب درس کے سلسلہ کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں استقامت عطا فرمائے۔

پرویز صاحب کے تبلیغی دورے

آپ کو معلوم ہے کہ پرویز صاحب ہر گذشتہ کنونشن سے قبل مختلف بزموں کی دعوت پر بعض اہم مراکز کے تبلیغی دورے پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ کراچی، پشاور، سیالکوٹ، لائلپور، مردان وغیرہ شہروں میں ان مواقع پر ان کے بصیرت افروز خطابات نہ صرف، ان کی دعوت کو آگے بڑھانے کا سازگار ذریعہ بنتے تھے بلکہ ان سے ان غلط فہمیوں کی گرد و غبار بھی صاف ہو جاتا تھا جو تحریک کے مخالفین نے اپنے جھوٹے پروپیگنڈے کے زور پر جگہ جگہ برپا کر رکھا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ سال میں پرویز صاحب کی بیماری بڑی تشویشناک صورت اختیار کر گئی۔ سابقہ کنونشن کے بعد انہوں نے بحالیٔ صحت کے لئے ایبٹ آباد اور گرد و نواح کے پہاڑی علاقہ میں ایک ماہ گذارنے کا پروگرام بنایا لیکن ابھی وہ ایبٹ آباد پہنچنے نہ پائے تھے کہ بیماری نے حملہ کیا اور ان کی حالت اس قدر خطرناک صورت اختیار کر گئی کہ انہیں بمشکل ہوائی جہاز سے لاہور پہنچایا گیا اور یہ خطرہ ٹل جانے کے بعد بھی یہ صورت رہی کہ پتہ نہیں کب بیماری کا یہ اچانک حملہ ہو اور ان کی زندگی کو پھر خطرے میں ڈال دے۔ ہر لمحہ کے اس متوقع اور مسلسل خطرہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لئے گھر سے باہر نکلنا خاصا مشکل ہو گیا اور بیرونی شہروں کے دورے کی کوئی صورت ممکن نہ رہی۔

خدا کا شکر ہے کہ اپریشنوں کے کٹھن مرحلہ کو کامیابی سے طے کرنے کے بعد آئے دن کا یہ خطرہ جو ہر وقت سر پر سوار رہتا تھا اب کلیتہً ٹل گیا ہے اور پرویز صاحب پھر اس قابل ہیں کہ جہاں ضرورت ہو ہر وقت پہنچ سکیں

درسِ قرآن کا کامیاب سلسلہ

محترم پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا باضابطہ، مؤثر اور بصیرت افروز سلسلہ ان کی قیام گاہ پر باقاعدگی اور کامیابی سے جاری ہے۔ اتوار کے اس اجتماع میں نہ صرف لاہور کے اہلِ بصیرت اور علمی حلقوں کے ممتاز اصحاب شریک ہوتے ہیں بلکہ اس درسِ قرآنی کی علمی و فکری اہمیت ہر اتوار کو بیرونی شہروں سے بھی بہت اہلِ ذوق حضرات کو لاہور میں کھینچ لاتی ہے۔

اس سلسلۂ درسِ قرآن کو بذریعہ ٹیپ ریکارڈ کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اور یہ ریکارڈ شدہ ٹیپ کراچی، راولپنڈی، ڈھاکہ، پشاور، کوئٹہ، مردان، لائلپور، لندن اور دوسرے شہروں میں پہنچائے

جاتے ہیں جہاں مقامی بزموں کے زیرِ اہتمام درسِ قرآن کی مجلسوں کا انتظام موجود ہے۔ اور اس طرح قرآن کی آواز درسِ قرآن کی ان مجلسوں کی وساطت سے پاکستان بلکہ بیرونِ پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں پہنچ رہی ہے اور دینِ خداوندی کی اس دعوتِ انقلاب سے مشرق و مغرب کی دنیا میں اہلِ علم صاحبِ ذوق کا ایک خاص طبقہ متعارف ہوتے چلا جا رہا ہے۔

اسی سلسلے میں کچھ عرصہ قبل ہمارے نہایت سرگرم کارکن محترم [illegible] دین صاحب نے اپنے رفیق عزیز محترم سرور خان صاحب کی معیت میں یہ منصوبہ بنایا کہ جن شہروں اور قصبوں میں بزمیں موجود ہیں لیکن وہاں ٹیپ ریکارڈ سے پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا باقاعدہ انتظام نہیں، وہاں وہ خود ٹیپ ریکارڈ لے کر پہنچیں اور اس طرح قرآن کی آواز ان علاقوں میں بھی خود پہنچ کر عوام تک پہنچائیں۔ چنانچہ گوجرانوالہ، لائل پور، ڈیرہ غازی خان اور ... دوسرے شہروں اور قصبوں میں یہ تجربہ کیا گیا اور اس کے نتیجے میں بعض شہروں نے اب ... خود اپنے ہاں ٹیپ ریکارڈ سے درسِ قرآن کا مستقل انتظام کر لیا۔ یہ ہر دو کارکن جس تن دہی اور جانفشانی سے تحریک کو آگے بڑھانے کے سلسلے میں دن رات سوچتے اور کام کرتے رہتے ہیں، وہ ادارہ کے لئے باعثِ صد تشکر ہے۔

ایک بنیادی حقیقت کی وضاحت

برادرانِ محترم! اس مرحلہ پر میں اس وضاحت کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں کہ ہماری ان بزموں کی تشکیل کا پس منظر کیا ہے اور ادارہ سے بزموں کا تعلق کس نوعیت کا ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے تاکہ اس سلسلہ میں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ آپ جانتے ہیں کہ محترم پرویز صاحب سالہا سال سے اپنی قرآنی فکر کو اپنے طور پر عام کئے جا رہے تھے۔ اپنی تصانیف کے ذریعے، طلوعِ اسلام کے ذریعے، اپنی تقاریر، خطبات اور مکاتیب کے ذریعے۔ جب اس فکر نے قلوب کو متاثر کیا تو ہر دو ان سے یہ تجویز سامنے آنے لگی کہ اگر ایک مقام کے ہم خیال متفرق احباب کسی جگہ مل بیٹھیں تو انہیں قرآن کریم کے فہم و تفہیم میں بھی آسانی رہے گی اور اس فکر کو عام کرنے میں وہ پرویز صاحب کا ہاتھ بھی بٹا سکیں گے۔ تجویز بڑی خوشگوار تھی اس لئے اسے قبول کر لیا گیا۔ یوں بزموں کی تشکیل کی بنا پڑی اور مختلف مقامات پر بزموں کی تشکیل کا آغاز ہوا۔ صاف ظاہر ہے کہ ان بزموں کی تشکیل کا مقصد یہ تھا کہ قرآنی احباب فکرِ قرآنی کو آگے بڑھانے کے لئے پرویز صاحب کا ہاتھ بٹا سکیں۔ اجتماعی کوششوں کے لئے یہ صورت اختیار کرتے ہوئے مسلمانوں کے مختلف اداروں کا انجام و مآل ہمارے سامنے تھا اس لئے یہ احتیاط ہر قدم پر خاص طور پر ملحوظ رکھی گئی کہ ہماری یہ سادہ سی پُرخلوص کوشش سیاسی ذہنیت سے متاثر نہ ہونے پائے ——— سیاسی ذہنیت سے مراد ہے لیڈری کی ہوس، باہمی حسد و رقابت، ذاتیات کی چپقلش، پبلک فنڈز اور املاک میں خورد برد کرنے کے امکانات وغیرہ۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے بزموں کی اصولی ہدایات میں یہ شقیں رکھ دی گئیں کہ

(i) بزم طلوعِ اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے۔ نہ کوئی مذہبی فرقہ۔ یہ ایک اجتماعی کوشش ہے اس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جسے ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔

(ii) ہر وہ مسلمان جو طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر، دستورِ اساسی اور اصولی ہدایات سے متفق ہو۔ اور ان ہدایات کو جو ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً جاری ہوں، تسلیم کرے وہ بزم کا ممبر بن سکتا ہے۔

(iii) کوئی رکن کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا۔

(iv) کوئی رکن ایسی بات نہیں کرے گا جس میں فرقہ سازی، پارٹی بازی یا تفرقہ انگیزی کا شائبہ تک بھی پایا جائے یا جس سے طلوعِ اسلام کے مسلک و مقصد کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو۔

(v) بزم میں صرف ایک نمائندہ ہوگا کوئی اور عہدیدار نہیں ہوگا۔

(vi) بزم تمام معاملات میں ادارہ کی ہدایات اور فیصلوں کی پابند ہوگی۔

(vii) نمائندہ کا تعلق براہِ راست ادارہ سے ہوگا۔

(viii) ادارہ کو حق حاصل ہوگا کہ وہ کسی رکن کو رکنیت سے یا نمائندہ کو نمائندگی سے الگ کر دے۔ یا کسی بزم کو کالعدم قرار دے دے۔ بزم وہی درست متصور ہوگی جس کی منظوری ادارہ نے دے رکھی ہو۔

(ix) نہ بزموں کے ہاں کوئی پبلک فنڈ ہوگا۔ نہ ادارہ بزموں سے کسی قسم کی مالی امداد قبول کرے گا۔

ان ہدایات سے واضح ہے کہ بزموں کی تنظیم بڑے سادہ انداز کی رکھی گئی لیکن ان پر ادارہ کی براہِ راست نگرانی ضروری سمجھی گئی۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ جس تنظیم کا مقصد ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کو عام کرنا ہو اس کے لئے ادارہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کی پوری پوری نگرانی کرے کہ کسی بزم یا اس کے کسی رکن کا قدم اس فکر سے ہٹ کر ادھر اُدھر تو نہیں اٹھ رہا، کیونکہ ہر ایسے غلط اقدام کی ذمہ داری کسی بزم یا اس کے ارکان پر نہیں بلکہ ادارہ پر عائد کی جائے گی اور معترضین کے سامنے اس کے لئے ادارہ کو جواب دہ ہونا پڑے گا۔

یہ تھی وہ صورت جو ہماری بزموں کی تنظیم میں پہلے دن سے ایک بنیادی حیثیت لئے چلی آ رہی ہے۔ یعنی بزموں کا کام ہے اس قرآنی فکر کی اشاعت میں پرویز صاحب کا ہاتھ بٹانا اور ادارہ کی ذمہ داری ہے اس کام پر براہِ راست اپنی نگرانی قائم رکھنا۔ چنانچہ بات بالکل صاف ہے کہ جو شخص اس کام میں پرویز صاحب کا ساتھ دینا چاہتا ہے وہ بزم کا رکن بن سکتا ہے۔ اس کے بعد جب تک وہ ان مقاصد سے متفق ہے جن کے لئے بزموں کی

تنظیم عمل میں آتی ہے، وہ ادارہ کا ساتھ دے اور اگر وہ کسی وجہ سے اس سے اتفاق نہیں رکھ سکتا تو بخوشی اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ بزموں کو کسی اور مقصد کا ذریعہ سمجھنا یا ان پر کسی دوسری نگرانی کے بارے میں کچھ سوچنا اس بنیاد کو زیر و زبر کرنے کے مترادف ہو گا جس پر بزموں کی تشکیل عمل آتی ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک گاڑی خانیوال کے راستے سے کراچی جا رہی ہے۔ ایک مسافر اس میں سوار ہو جائے اور چند اسٹیشن گذرنے کے بعد یہ محسوس کرے کہ اس نے کراچی کی بجائے لپشاور یا کراچی براستہ ملتان جانا تھا، تو اس کے لئے دیانتدارانہ صورت یہی ہے کہ وہ اس گاڑی کو چھوڑ کر اپنی حسب منشا گاڑی پکڑ لے۔ یہ نہیں کہ گاڑی سے اُترنے کی بجائے وہ یہ جھگڑا شروع کر دے کہ اس کی خاطر اس گاڑی کو پشاور یا ملتان کا رُخ بدل لینا چاہیئے۔ اور جب اس سے کہا جائے کہ وہ اپنے مطلب کی گاڑی میں کیوں سوار نہیں ہو جاتا تو وہ کہنے لگے کہ مجھے اس گاڑی سے بڑی محبت ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا اس لئے اسے میری مرضی اور میری اپنی متعین کردہ منزل کی طرف چلنا ہو گا۔ تو پھر آپ سوچئے کہ ایسے مسافر کا صحیح مقام کیا ہو گا

لہٰذا برادرانِ عزیز! طلوعِ اسلام کی گاڑی میں سوار ہونے والوں کو اچھی طرح سوچ لینا چاہیئے کہ اس گاڑی کی منزلِ مقصود کون سی ہے اور طریق کار کیا۔۔ جو ان امور سے متفق نہیں اسے چاہیئے کہ وہ اس گاڑی میں سوار ہی نہ ہو۔ اور اگر کسی غلط فہمی کی بنا پر اس میں سوار ہو گیا ہے تو اس سے اُتر کر اپنی حسب پسند اور حسب مطلب گاڑی میں سوار ہو جائے۔ یہ نہیں کہ وہ گاڑی کو نقصان پہنچانے اور مسافروں کو تنگ کرنے کے درپے ہو جائے۔ اس میں شبہ نہیں سفر کو آرام دہ بنانے کے لئے مسافروں کے مشورے شکریہ کے مستحق ہونگے۔ لیکن یہ تو ناممکن ہو گا کہ کسی مسافر کی مصلحت یا سہولت کی خاطر گاڑی اپنی منزل کا رُخ بدل دے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ احباب اس وضاحت پر پوری طرح غور فرمالیں گے اور اسے ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں گے۔ قرآنی فکر کی اس تحریک کی نگرانی کا فریضہ ادارہ طلوعِ اسلام ہی کے سپرد رہنا چاہیئے اس نگرانی سے مقصود یہ ہے۔ کہ گاڑی اپنی منزل کی طرف بڑھتی جائے اور اس کا رُخ کسی دوسری سمت بدلنے نہ پائے۔ اس سلسلے میں اگر کسی کے دل میں کوئی غلط فہمی یا خود فریبی موجود ہے تو اس وضاحت کے بعد اسے ختم ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کی کامیابی کا تقاضا یہی ہے اور اس کے خوشگوار مستقبل کا اسی پر انحصار ہے۔

ایک ضروری تجویز اپنی رپورٹ ختم کرتے ہوئے میں آپ احباب سے ایک ضروری گذارش کروں گا اور وہ یہ کہ اس کنونشن میں بعض ضروری امور ایسے ہیں جنہیں مؤثر طور پر طے کرنا شد ضروری ہے۔ مثلاً

(۱) اس فکر کی نشر و اشاعت کے لئے کون سے مؤثر ذرائع اختیار کئے جائیں۔

(۲) ماہنامہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بڑھانے کے لئے کیا کچھ کیا جائے۔

(۳) پرویز صاحب کے تبلیغی دوروں کی کامیابی کے لئے کیا صورت کی جائے۔

میری رائے ہے کہ ان مقاصد، اور ان کے علاوہ دیگر اہم مقاصد کے متعلق غور و فکر کرنے کے لئے اسی اجلاس میں ایک سبجیکٹ کمیٹی کی تشکیل عمل میں لے آنی چاہیئے جو اس کنونشن کے آئندہ اجلاسوں کے لئے اس سلسلے میں ٹھوس اور موثر تجاویز سامنے لاسکے۔ [1]

شکریہ

رپورٹ کے خاتمہ پر میں آپ احباب کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے ادارہ سے ہمیشہ خوشگوار تعاون کا ثبوت دیا اور اس کے دست و بازو بن کر تحریک قرآنی کو آگے بڑھانے میں حسب استطاعت سرگرم کار رہے۔ والسلام

---

[1] اس سبجیکٹ کمیٹی کی تشکیل اسی وقت عمل میں آگئی تھی (طلوعِ اسلام)

سلسبیل

پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مضامین کا تازہ مجموعہ

اپنی نوعیت کی واحد کتاب۔

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ——— آٹھ روپے

(یہ کتاب چیپ ایڈیشن میں شائع نہیں کی گئی۔)

میرزا محمد خلیل صاحب
صدر۔ طلوعِ اسلام کنونشن کمیٹی

اِستقبالیہ

برادرانِ عزیز! کنونشن ہر سال اپریل کے شروع وسط یا آخر میں منعقد ہوتی رہی ہے میرا خیال ہے کہ آپ میں سے وہ احباب جنہیں واقعات کا پورا علم نہیں دل میں یہ سوچتے ہونگے کہ امسال اس کا انعقاد نومبر میں کیوں ہو رہا ہے۔ اس تبدیلی یا التواکی بڑی وجہ تو یہ ہے کہ اپریل کا مہینہ کالج کے طلباء کے لئے امتحانوں کی تیاری کی وجہ سے غیر معمولی مصروفیت کا ہوتا ہے اس لئے وہ ان دنوں کنونشن کے کھلے جلسوں اور مخصوص مذاکرات میں اتنی دلجمعی سے شامل نہیں ہو سکتے جتنا امتحانوں اور موسم گرما کی تعطیلات سے فارغ ہونے کے بعد ہمارے نونہالوں کی اس وقت کے پیشِ نظر کنونشن کا انعقاد اکتوبر میں ہونا تھا اور اس بارے میں طلوعِ اسلام کی ایک اشاعت میں اعلان بھی کیا گیا تھا لیکن جب وقت قریب آیا تو معلوم ہوا کہ اکتوبر کے وسط سے نومبر کے وسط تک "بنیادی جمہوریت" کے الیکشنز کی گہما گہمی بھی بڑی حد تک مانع ہوگی۔ لہٰذا اس کے مطابق مزید التوا کا اعلان کرنا پڑا اور بالآخر بزمہائے طلوعِ اسلام کے نمائندوں کے خصوصی اجلاس منعقدہ ۳ر اکتوبر میں سردی کے موسم کی آمد کے احساس کے باوجود احباب نے کنونشن کے انعقاد پر اصرار کیا اور ۱۹ سے ۲۲ نومبر کی تواریخ طے پائیں۔ اس کے بعد اخبارات میں الیکشنز کے ۹ نومبر تک تکمیل کے اعلان کے پیشِ نظر یہ تواریخ ۱۲ سے ۱۵ نومبر یعنی ایک ہفتہ قریب کر دی گئیں تاکہ موسم کی بڑھتی ہوئی خنکی سے بچاؤ بقدر ایک ہفتہ کے بھی ہندو بیرون کے لئے کچھ نہ کچھ سہولت کا باعث ہو جائے۔ آپ احباب کو جو صعوبت اور زحمت دور دراز کا سفر اختیار کر کے اس اجتماع کو کامیاب بنانے میں ہوتی ہے ہمیں اس کا پورا احساس ہے اور اس بات کا بھی کہ آپ کو جو آرام اپنے گھروں میں میسّر ہے وہ اس

تاریخوں کا انعقاد

کیمپ میں نہیں مل رہا۔ آپ کی اس محفل میں کشاں کشاں تشریف آوری قرآن سے وابستگی کا بیّن ثبوت ہے جس سے ہمیں بیحد مسرت ہوتی ہے۔ لہٰذا میں لاہور کے جملہ احباب کی طرف سے آپ سب احباب کو شکریہ اور خوش آمدید پیش کرتا ہوں۔

۲۔ حسبِ سابق بزمِ طلوعِ اسلام لاہور میزبان ہے اور اس کا نمائندہ ہونے کی جہت سے میں کنونشن کمیٹی کا صدر ہوں یہ بزم اگرچہ بیشتر غریبوں پر مشتمل ہے لیکن اس نے تحریک سے باہر کسی سے کوئی مالی مدد نہیں لی۔

اخراجات

اس کے تمام اخراجات انہی غریب میزبانوں نے اپنے ذمّہ لئے ہیں اور انہوں نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ باہر سے آنیوالے مہمانوں میں سے جو پورا خرچ نہ دے سکیں ان سے وہی قبول ہو گا جو وہ آسانی ادا کر سکیں۔

۳۔ طلوعِ اسلام کی تحریک کی، فرقہ بند مذہب کے اجارہ داروں کی طرف سے مخالفت کے باعث ہمیں اپنے نصب العین سے متعلق پروگراموں میں متعدد رکاوٹیں پیش آتی رہتی ہیں۔ یہ مخالفتیں ہمیشہ باہر کی ہوتی ہیں اور ان

داخلی تخریب

کا مقابلہ کرنے میں کچھ لطف آتا ہے لیکن بدقسمتی سے اس مرتبہ ہمیں داخلی مخالفت سے بھی واسطہ پڑ گیا اور آپ جانتے ہیں کہ داخلی مخالفتوں کا مقابلہ کتنا جگر سوز ہوتا ہے۔ ان ناخوشگوار واقعات کی تفصیل نمائندگان کے خصوصی اجلاس میں بیان کر دی گئی تھی اس لئے میں انہیں دہرانا نہیں چاہتا بجز اس کے کہ ہمارے ان دوستوں کی طرف سے تخریبی کارروائیوں کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے چنانچہ کراچی اور لاہور سے شائع شدہ گشتی چٹھیاں جو بڑی تعداد میں چھاپ کر بھیجی گئی ہیں اس کی تازہ ترین شہادت ہیں اور ان میں سے ایک میں یہ بھی وعدہ کیا گیا ہے کہ یہ کارِ خیر صدقہ جاریہ کے طور پر مسلسل آگے چلے گا۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ کی یہ کیسی عبرتناک تفسیر ہے۔ بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ نہ تو ہم نے اس کا کوئی اثر لیا اور نہ ہی یہ چیزیں ہمارے کام پر کسی طور پر اثر انداز ہوئیں۔

۴۔ کنونشن کے محلِ انعقاد کے سلسلے میں اکثر یہ بات دل میں آیا کرتی تھی کہ ہماری ان تمام سرگرمیوں کا مرکز ادارہ طلوعِ اسلام ہی کیوں نہ بن جائے فالحمد للہ کہ اس مرتبہ ہماری یہ آرزو پوری ہوئی۔ ادارہ تو بانیٔ تحریک کے

مقامِ کنونشن

مکان ہی میں واقع ہے لیکن اس میں اس عظیم اجتماع کے لئے جگہ کم تھی۔ اس سلسلے میں شیخ سراج الحق اور محترم محمد یوسف صاحب نے جس کشادہ ظرفی سے اپنے مکانوں کے دروازے کھول دیئے ہیں اس کے لئے ہم ان کے بدل شکر گذار ہیں۔

۵۔ سالِ گذشتہ کی طرح اس کنونشن کا ایک خصوصی اجتماع اس مذاکرے پر مشتمل ہے جس میں قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ اپنے تاثرات پیش کرے گا۔ یہ عنوان بڑا اطمینان بخش اور امید افزا ہے اور آپ یہ جان کر خوش ہونگے

مذاکرہ

کہ آپ کی یہ قرآنی تحریک ہماری نئی نسل میں بڑی عمدگی اور سنجیدگی سے پھیل رہی ہے۔ بالخصوص گرلز سٹوڈنٹس کے اندر۔ جس کے لئے میری عزیزہ اور پرویز صاحب کی طاہرہ بیٹی پروفیسر مس شمیم انور مستحق مبارکباد ہیں کہ ان کی جنون آمیز انتھک کوششوں سے یہ قرآنی فکر اس طرح عام ہو رہی ہے۔

۶۔ یوں تو بزم لاہور کے تمام اراکین آپ کے میزبان ہیں لیکن ان میں سے نیز دیگر احباب میں سے جنہوں نے اسے مقدور بھر کامیاب بنانے میں دن رات کوششیں کی ہیں نا سپاس گذاری ہوگی اگر میں اپنی اور آپ احباب کی طرف

سپاس گذاری

سے ان کا شکریہ ادا نہ کروں۔ بالخصوص شیخ سراج الحق۔ راجہ محمد اکرم صاحب۔ مظفر حیات مفتی صاحب۔ چوہدری عبدالرحمٰن صاحب۔ قمر بٹ صاحب۔ عبدالعلی صاحب۔ طالب حسین صاحب۔ میر محمد اسحاق صاحب۔ خواجہ محمد لیٰسین صاحب۔ سرور خاں بٹالوی صاحب۔ محمد رشید صاحب۔ محمد اشرف صاحب۔ مرزا محمد جمیل صاحب۔ امیر الدین صاحب۔

۷۔ نمائندگان بزم طلوع اسلام کے خصوصی اجتماع منعقدہ ۳ میں میرے ذمہ دو فرائض عائد کئے گئے تھے۔ ایک یہ

کالج فنڈ

کہ میں کالج فنڈ کے سلسلے میں میاں عبدالخالق کی طرف رجوع کروں۔ میں نے ۲۱ اکتوبر کو ایک چٹھی لکھی تھی جسے میں پڑھ کر سنا دینا مناسب سمجھتا ہوں[۱]۔ اس چٹھی کا جو جواب مورخہ ۶ میاں صاحب کی طرف سے موصول ہوا ہے وہ بھی میں آپ کو پڑھ کر سنا دیتا ہوں[۲]۔ بعض احباب کے متعلق میرے علم میں ہے کہ انہوں نے میاں عبدالخالق صاحب کو لکھا تھا کہ روپیہ ادارہ کو دے دیا جائے۔ لیکن نہ تو انہوں نے ادارہ کو روپیہ دیا ہے اور نہ معطی کو واپس کیا ہے۔ آپ احباب اس کے بعد جو فیصلہ کریں گے اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔

لغات فنڈ

دوسرا اہم کام لغات فنڈ کے ۔/۶۱۲۲ روپیہ کی میزان لمیٹڈ سے بازیابی تھی اس کے لئے میں نے ۲۱/۱۰/۶۴ کو میزان کے مینجنگ ڈائرکٹر کو جو چٹھی لکھی تھی اُسے میں پڑھ کر سنا دیتا ہوں[۳]۔ اس کا جواب آنریری ڈائرکٹر میزان پبلی کیشنز نے اپنے خط مورخہ ۶/۱۱/۶۴ (موصولہ ۱۰/۱۱/۶۴) میں جو دیا ہے وہ بھی میں پڑھ کر سنا دیتا ہوں[۴]۔

۸۔ یوں تو تحریک کو فروغ دینے کے سلسلے میں آپ احباب مناسب تجاویز سوچیں گے لیکن میں اپنی اُس تجویز کو جسے میں نے سابقہ کنونشن کے الوداعی اجلاس میں پیش کیا تھا پھر دُہرانا چاہتا ہوں کہ ہماری اپنی عمارت کا ہونا ضروری ہے اگر یہ درسگاہ کی شکل میں ہو تو ہم اپنے مفکرِ قرآن کی عمر کے باقی ماندہ حصہ سے (خدا انہیں بہت لمبی عمر عطا کرے) ایسا فائدہ اٹھا سکیں گے جس کا سلسلہ صدیوں تک قائم رہے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو

تعمیر عمارت

کم از کم ہمارا ایک ہال تو ہونا چاہیئے۔ میں تجویز کروں گا کہ آپ اس کے لئے ابھی ہی ایک سب کمیٹی بنا لیں تاکہ آپ کے رخصت ہونے سے پہلے اس کا کوئی معین اور

[۱] تا [۴] صفحہ ۵۵ تا صفحہ ۶۵۔ یہ چٹھیاں کنونشن میں سنادی گئی تھیں لیکن انہیں یہاں درج نہیں کیا جا رہا۔ طلوعِ اسلام

قابلِ عمل شکل سامنے آسکے۔

جہاں تک ہمارے دوستوں کی تحریری کارروائیوں کا تعلق ہے میرا تخمینہ ہے کہ ان کی کامیابی اُسی صورت میں ہوتی ہے جب ہم اُن کا کوئی اثر لے لیں یا کم از کم ان کا کوئی اثر نہ لیں۔ اگر بات نہ بنیں اور اگر وہ کچھ لکھ کر بھیجیں تو اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیں تو ان کے یہ اقدامات اپنی موت آپ مر جائیں گے۔

ہم نے امکان بھر کوشش کی ہے کہ آپ کا یہاں کا قیام آرام دہ ہو لیکن اگر اس میں کوئی سقم رہ جائے تو اس کے لئے مجھے امید ہے کہ آپ اس کا خیال نہ کریں گے کہ ہمارے اجتماع کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ ہم سب مہمان بھی ہیں اور میزبان بھی۔ والسلام

کتابوں کی قیمت میں رعایت

طلوعِ اسلام کنونشن کی تقریب پر بعض کتابوں کی قیمت میں "خصوصی" رعایت دی گئی تھی۔ اکثر احباب نے جو کسی وجہ سے کنونشن میں شریک نہیں ہو سکے تھے ہمیں لکھا ہے کہ انہیں اس رعایت سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے۔ بنا بریں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان کتابوں کی قیمت میں جو رعایت دی گئی تھی اس کی میعاد ۳۱ دسمبر تک بڑھا دی جائے۔ یہ کتابیں حسبِ ذیل ہیں۔

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت
۱۔ انسان نے کیا سوچا؟	۱۲/- روپے	۸/- روپے
۲۔ الفتنۃ الکبریٰ	۶/- ،،	۴/- ،،
۳۔ مجبرالاسلام	۸/- ،،	۴/- ،،
۴۔ لغات القرآن (سیٹ)	۵۷/- ،،	۴۰/- ،،
۵۔ سلیم کے نام خطوط (سیٹ)	۲۰/- ،،	۱۴/- ،،
۶۔ طاہرہ کے نام خطوط (سیٹ)	۴/۵۰ ،،	۳/- ،،
۷۔ ابلیس و آدم	۸/- ،،	۶/- ،،
۸۔ برقِ طور	۶/- ،،	۴/- ،،
۹۔ شعلۂ مستور	۶/- ،،	۴/- ،،
۱۰۔ مزاج شناسِ رسول	۴/- ،،	۲/- ،،
۱۱۔ سلسبیل	۸/- ،،	۶/- ،،

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

فرمایا تھا کہ " ایک طرف ایک مرد ہے جس میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں۔ اور دوسری طرف ایک عورت ہے جس میں عورت ہونے کے سوا کوئی عیب نہیں۔" اس سے واضح ہے کہ متحدہ محاذ میں کوئی مرد (مودودی صاحب سمیت) ایسا نہیں جس میں ایک بھی خوبی ہو اور اسے اس خوبی کی بنا پر صدر محمد ایوب خان کے مقابلہ کے لئے کھڑا کیا جا سکے۔ اسی لئے انہوں نے ایک عورت کو بطور امیدوار کھڑا کیا ہے۔ واضح رہے کہ جس عورت (محترمہ مس فاطمہ جناح) کے متعلق اب کہا جا رہا ہے کہ ان میں عورت ہونے کے سوا کوئی عیب نہیں، اس کے متعلق آج سے تین سال پہلے جب انہی مودودی صاحب سے پوچھا گیا تھا کہ وہ صدارت کے منصب کی اہل ہو سکتی ہیں یا نہیں تو انہوں نے کہا تھا کہ عورت کا عورت ہونا ہی ایک ایسا عیب ہے جس کی بنا پر اسے سیاسی امور میں دخیل ہونے کا اہل قرار ہی نہیں دیا جا سکتا۔ یہ خدا اور رسول کا فیصلہ ہے اور اس فیصلہ کے بعد کسے مجالِ سخن ہو سکتی ہے (ملاحظہ ہو محترم محی الدین صاحب کی کتاب " اسلام بیسویں صدی میں")

یہ تو ان حضرات کی اہلیت اور دیانت کا عالم ہے۔ اور اسکیم ایسی بنائی جا رہی ہے کہ ملک کا نظم و نسق بالواسطہ انہی کے ہاتھ میں رہے ـــــ یعنی سراسر تخریب پسند، نااہل اور بے اعتماد لوگوں کے ہاتھ میں ـــــ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

ہم ملک کے سنجیدہ طبقہ کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ انتخاب کے اس مسئلہ پر جذبات سے الگ ہو کر غور کریں۔ یہ مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں۔ اس وقت ہم تاریخ کے ایک نازک ترین موڑ پر کھڑے ہیں۔ ایسے ہی نازک موڑ پر جیسے ہم تحریک پاکستان کے آغاز میں کھڑے تھے۔ اس لئے آپ اس سوال پر یونہی رواروی میں نظر نہ ڈالیں۔ اسے اپنی زندگی اور آنے والی نسلوں سے متعلق وقت کا اہم ترین سوال سمجھیں ـــــ عصرِ حاضر کے انداز جمہوریت کی رو سے رائے دہندگان کے انتخاب کا میدان سمٹ کر صرف ان امیدواروں تک محدود ہو جاتا ہے جو کسی منصب کے لئے سامنے آتے ہیں۔ اس وقت (ان سطور کی تحریر کے وقت تک) منصب صدارت کے لئے دو ہی امیدوار سامنے آئے ہیں۔ محترمہ مس فاطمہ جناح اور محترم صدر محمد ایوب خان۔ اس لئے سوال صرف ان دونوں میں تقابل کا ہے۔ اور اس تقابل میں معیارِ ترجیح یہ امر ہے کہ ان دونوں میں سے ملک کی سلامتی اور استحکام کا بہترین ضامن کون ہو سکتا ہے۔ محترمہ مس فاطمہ جناح اس سے پہلے نہ کبھی میدان سیاست میں آئی ہیں۔ نہ انہیں ملک کے نظم و نسق کا کوئی تجربہ ہے۔ جو پارٹیاں ان کی تائید میں آگے بڑھی ہیں، ان کے ہاتھوں ملک جس قدر محفوظ رہ سکتا ہے اسکا اجمالی سا ذکر ہم سابقہ صفحات میں کر چکے ہیں۔ ان کے برعکس، اس حقیقت کے اعتراف میں دو آراء نہیں ہو سکتیں کہ صدر محمد ایوب خان نے ملک کو اس وقت تباہی سے بچایا جب یہ ان لوگوں کے ہاتھوں جو اس وقت اس کے سب سے بڑے بہی خواہ بن کر سامنے آ رہے ہیں، بربادی کے جہنم کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ پھر اس کے بعد اس چھ سال کے عرصہ میں، ملک پر خاصے نازک وقت بھی آئے لیکن ان میں بھی صدر موصوف کی ہمت نے اس پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔ پھر اس حقیقت کے اعتراف میں بھی کسی کو

کلام نہیں ہو سکتا کہ جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے، اِس وقت پاکستان کا وقار سابقہ کے مقابلہ میں، کہیں زیادہ وقیع اور بلند ہے۔ جہاں تک اندرونِ ملک کے نظم و نسق کا تعلق ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بہت سے اسقام و نقائص ہیں۔ لیکن ان پر تنقید کرتے وقت ایک حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اور وہ یہ کہ حکومت کوئی بھی برسرِ اقتدار ہو (بجز قرآنی حکومت کے) اس کے خلاف شکایات ضرور رہیں گی۔ ان میں سے جہاں تک جائز شکایات کا تعلق ہے ان کے رفع کرنے کی ایک ہی شکل نہیں ہوتی۔ یعنی حکومت کا بدل دینا۔ یہ شکل اُس وقت اختیار کی جانی چاہیئے جب اصلاح حال کی کوئی اور صورت باقی نہ رہے اور ملک کی ابتری اس مقام تک پہنچ جائے جہاں اس کی سالمیت ہی خطرے میں پڑ جائے۔ پھر جہاں تک حکومت بدلنے کا تعلق ہے، جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، اِس وقت سوال صرف دو امیدواروں میں باہمی تقابل کا ہے۔ ان میں سے ایک (محترمہ مس فاطمہ جناح) کی یہ کیفیت ہے کہ انہیں ملکی نظم و نسق کا کوئی تجربہ نہیں اور ان کے زیرِ اقتدار ملک کی سالمیت کے خطرہ میں پڑ جانے کا امکان قوی ہے۔ دوسری طرف وہ امیدوار ہے جس کے ہاتھوں ملک کا استحکام ایک حقیقت بن کر ہمارے سامنے آچکا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں میں سے ترجیح اِس دوسرے ہی کو دی جائے گی۔ یاد رکھیئے ملک میں نظم و نسق کی خرابیاں برداشت کی جا سکتی ہیں (اس لئے کہ ان کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے)۔ اگر ملک میں ترقی اور خوش حالی کی رفتار سست رہی ہے تو اسے تیز کیا جا سکتا ہے۔ اگر معاشرتی خرابیوں اور برائیوں کا انسداد یا ازالہ ہماری حسبِ توقع نہیں ہوا تو اسے بھی برداشت کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے لئے جد و جہد کی جا سکتی ہے۔ لیکن سوچیئے کہ اگر ملک کی سالمیت ہی خطرے میں پڑ جائے تو اسے کس طرح برداشت کیا جا سکتا ہے؟ ملک باقی رہے گا تو اس میں اصلاح بھی ہو سکے گی۔ لیکن اگر (خدانکردہ) ملک ہی باقی نہ رہا تو پھر قوم کا بنے گا کیا؟ کیا کسی ملاح کے خلاف حقیقی یا وضعی شکایات کا علاج یہ ہے کہ کشتی کو ان لوگوں کے حوالے کر دیا جائے جو اس کے پیندے میں چھید کرنے کے لئے تُلے بیٹھے ہوں! سوچیئے کہ ایسا کرنے میں مسافروں کا کیا حشر ہوگا! لہٰذا وقت کا اہم تقاضا ہے کہ ہم سطحی جذبات کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچیں اور قدم جما کر سوچیں کہ اگر اِس وقت یہ حزبِ مخالف اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا!

طلوعِ اسلام کا آئندہ شمارہ

ہم معذرت خواہ ہیں کہ دسمبر اور جنوری کے زیرِ نظر مشترکہ شمارہ (کنونشن نمبر) کی دوگنی ضخامت کے باوجود اس میں طلوعِ اسلام کنونشن سے متعلق بڑے اہم خطابات اور مقالات بوجہ عدمِ گنجائش شائع ہونے سے رہ گئے ہیں۔ ان میں محترم پرویز صاحب کے دو اہم خطاب (مومن کسے کہتے ہیں؟ اور۔ قانون کی حکمرانی) بھی شامل ہیں۔ ان خطابات اور مقالات کو انشاء اللہ العزیز طلوعِ اسلام کے آئندہ شمارہ (بابت فروری ۱۹۶۵ء) میں ۔۔۔ شائع کر دیا جائے گا۔ یہ شمارہ ۲۰ جنوری تک منظرِ اشاعت پر آجائے گا۔

قارئین اور ایجنٹ حضرات اسے نوٹ فرمالیں۔

ناظم ادارہ

ڈاکٹر سید عبدالودود
طلوعِ اسلام کنونشن میں تقریر

جمہوریت

برادرانِ محترم۔ گذشتہ سال میں نے اسی پلیٹ فارم سے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آج پاکستان کا مسئلہ کیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آج پاکستان کا مسئلہ جمہوریت کی بحالی نہیں اور مسئلہ حکومتوں کی تبدیلی بھی نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان میں لا الٰہ الا اللہ ـــــــ کو عملی طور پر متشکل کیا جائے دُوسرے الفاظ میں یہ کہا تھا کہ قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کے تابع اسلامی نظام ہی پاکستان کے مسائل کا حل ہے۔ لیکن آج ڈیڑھ برس گذر جانے کے بعد بھی یہ مسئلہ جُوں کا تُوں کھڑا ہے بلکہ موجودہ انتخابات کے دوران میں یہ مسئلہ زیادہ اُبھر کر سامنے آگیا ہے۔ ہر طرف جمہوریت کی بحالی کا رونا ہے حزبِ مخالف کے لوگ کہتے ہیں کہ ۱۹۵۸ء کے بعد پاکستان سے جمہوریت رخصت ہو گئی اور وہ نئے سرے سے مُلک میں جمہوریت لوٹانے کے لئے اُٹھے ہیں اور سابقہ جمہوریت کی بحالی ہی مُلک کا مُنتہا مسئلہ ہے برسرِاقتدار طبقہ کہتا ہے کہ جو جمہوریت آج مُلک میں رائج ہے وہی پاکستانی عوام کے مزاج کے موافق ہے۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کا ذہن اس مسئلہ پر صاف نہیں ہے وہ نہیں سمجھتے کہ جمہوریت دراصل شے کیا ہے لیکن چُونکہ لفظ جمہوریت کا شور عام ہے اس لئے ان کے تحت الشعور میں اتنی بات ضرور ہے کہ یہ کوئی ایسی شے ہے جس پر قوموں کی زندگی کا دارومدار ہے۔

مغربی جمہوریت کی حقیقت

آئیے ہم آج اس بات کا جائزہ لیں کہ مغربی جمہوریت کیا ہے اور آیا واقعی اس میں قوموں کی فلاح کا راز مُضمر ہے۔ کسی شے کا اچھا یا بُرا ہونا اس بات پر منحصر نہیں کہ چُونکہ بعض لوگ بہ آوازِ بلند پکار رہے ہیں کہ فلاں چیز اچھی ہے اس لئے وہ ضرور اچھی

ہو گی کسی شے کو اس کے (MERITS) پر پرکھنا چاہیے آج کل مغرب کی تقلید ایک فیشن بن گیا ہے کچھ لوگ ایسے ہیں جو مغربیت کو اپنانے میں اپنی برتری خیال کرتے ہیں لیکن جو ایسا نہیں کرتے وہ بھی غیر شعوری طور پر اسی طرف کھچے چلے جاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ مغرب کے سائنسی انکشافات نے ایک چکا چوند روشنی پیدا کر دی ہے لیکن یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ تسخیرِ کائنات میں ایک قوم عقل و بصیرت کے زور پر آگے نکل سکتی ہے لیکن انسانیت کے مسائل خالی عقل کے بل بوتے پر حل نہیں ہوتے۔

اہم سوالات

مغربی جمہوریت کے متعلق جو اہم سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں (۱) کیا اہلِ مغرب اپنے وضع کردہ جمہوری نظام سے خود مطمئن ہیں؟ (۲) کیا وہ لوگ جو ایک طرف مغربی جمہوریت کو پاکستان کے مسائل کا حل بتا رہے ہیں اور دوسری طرف رسول اللہ صلعم کے اسوۂ حسنہ پر چلنے کے لئے کہہ رہے ہیں کیا وہ عوام کے سامنے دو متضاد نظریۂ زندگی پیش نہیں کر رہے؟ کیا پاکستان کے مسائل کا حل مغرب کا جمہوری نظام ہے یا اسلامی نظام؟

اقوامِ مغرب کے ہاں جمہوریت کی بنیاد حسبِ ذیل مفروضات پر ہے (۱) اس نظام میں حاکم اور محکوم کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ عوام کی حکومت کے مفاد کی خاطر اور عوام ہی کی وساطت سے، اصول اس کی بنیاد ہے (۲) عوام کا منشا ان کے نمائندگان کے ذریعہ معلوم ہو سکتا ہے (۳) کسی چیز کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار ان نمائندگان کی کثرتِ رائے سے ہوتا ہے (۴) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے پڑتے ہیں۔

مفکرینِ مغرب کے تاثرات

لیکن ایک مدت کے تجربہ کے بعد دورِ حاضرہ کے مغربی مفکرین خود اس نظام کے مخالف نظر آتے ہیں۔ پروفیسر کوبن (COBBAN) لکھتا ہے اگر سیاست کو نظری حیثیت سے نہیں بلکہ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصور کرنا عملی ناممکنات میں سے ہے عملاً حکومت افراد کے ایک طبقہ پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا افراد کے دوسرے طبقے کا نام ہوتا ہے۔ جب معاشرہ اپنی ابتدائی قبائلی زندگی سے آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔" (CRISIS OF CIVILISATION) اس نظریے کے متعلق کہ صحیح وہ ہے جسے اکثریت صحیح کہہ دے پروفیسر مذکور لکھتا ہے کہ "اگر کسی بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی فیصلہ وہ صحیح ہو سکتا ہے جو دراصل صحیح ہو نہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔"

اقتدارِ اعلیٰ کے متعلق پروفیسر کوبن لکھتا ہے "آج اس مفروضہ کو حقیقتِ ثابتہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ قوم کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے اور اس کے بعد بحث صرف اس مسئلہ کے متعلق رہ جاتی ہے کہ اختیارات کسی فردِ واحد کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں یا کسی نمائندہ جماعت کے۔ لیکن ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اقتدارِ اعلیٰ کا تصور صحیح بھی ہے؟"

یہ ہے اصل مسئلہ کہ آیا قانون کا سرچشمہ عوام ہونا چاہیئے یا اس کے علاوہ کوئی اور سرچشمہ بھی ہے؟ یعنی پروفیسر مذکور کے نزدیک سوال یہ نہیں کہ قانون کی تدوین کا حق کسی ایک فرد کو حاصل ہے یا نمائندہ اسمبلی کو بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا انسانوں کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ حدود وقیود قوانین وضع کرلیں۔ پروفیسر مذکور آگے چل کر لکھتا ہے کہ انسانوں کو یہ حق حاصل ہی نہیں۔ تمام قوانین اپنے اصل کے اعتبار سے پہلے سے ہی مدون شدہ ہیں انسانوں نے فقط ان قوانین کو نافذ کرنا ہے۔ ان اصولی قوانین کا سرچشمہ پروفیسر مذکور کے نزدیک قانون فطرت ہے۔ چنانچہ پروفیسر کرہن کے نزدیک وہ بنیاد ہی غلط ہے جس پر جمہوریت کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔ حق حق ہوتا ہے خواہ اس کی تائید میں ایک ہاتھ بھی نہ اٹھے اور باطل باطل ہوتا ہے خواہ اسے سو فیصدی تائید حاصل ہو۔

کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ایونگ (EWING) اپنی کتاب (THE INDIVIDUAL, THE STATE AND WORLD GOVERNMENT) میں لکھتا ہے کہ نظام جمہوریت کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اس لئے کہ (۱) یہ نظام باہمی رضامندی کے قریب تر چلا جاتا ہے (۲) یہی وہ نظام ہے جس میں مختلف مفادات کی نمائندگی حاصل ہو جاتی ہے اور ہر سیاسی آزادی اس نظام کی رو سے حاصل ہوتی ہے۔ تاریخ انسانی کے ریکارڈ پر بہت اچھا پڑتا ہے لیکن اس دلیل سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ جمہوری انداز حکومت نوع انسانی کے لئے بہترین نتائج کا حامل ہے ان دلائل سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اس نظام کے بہت سے فائدے ہیں لیکن دوسری طرف اس کے نقصانات ان کے فوائد سے بڑھ کر ہیں۔ جمہوریت کے خلاف سب سے بڑی اصولی دلیل اس قدر واضح ہے کہ اس کی لمبی چوڑی تشریح کی ضرورت نہیں۔ ڈیموکریسی کے معنی ایک ایسا انداز حکومت ہے جس میں ہر انسان دخیل ہوتا ہے لیکن حکومت ایک خاص فن ہے اور بڑی مشکل سائنس اور ہر شخص میں نہ اس کی صلاحیت ہو سکتی ہے نہ اس کا ذوق۔ نہ اس کے لئے فرصت نہ میلان کہ وہ اس فنی سائنس پر عبور حاصل کر سکے۔ جس طرح ہر عطائی فن طب کا ماہر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جمہوریت کے معنی ہیں ایسے لوگوں کی حکومت جو فن حکومت کے ماہر نہ ہوں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے طب کے کسی اہم سوال کے متعلق عوام کی کثرت رائے سے فیصلہ کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں ماہر فن ڈاکٹر کی رائے بھی ایک ہی شمار کی جائے۔

جمہوریت کے خلاف یہی اعتراض افلاطون نے کیا تھا اس نے کہا تھا کہ فن حکومت جیسے فریضے کو عوام کے سپرد کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔ اسے ملک کے بہترین افراد کے سپرد کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنی دانش اور آراء سے عوام کی تعلیم کا بند و بست کرتے رہیں۔۔

اٹالوی مدبر میزینی (MAZZINI) لکھتا ہے کہ اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدت عقائد نہ ہو۔ جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے ہو سکتے ہیں یا انسان کے وہ ایک انسان

ہو ملوکیت ہو یا زیادہ جمہوریت، بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی باقی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقتور افراد کے غلبے سے محفوظ رکھ سکے؟ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو تو ہمارے پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پرکھ سکیں گے کہ فلاں کام یا فلاں فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ اگر خدا درمیان میں نہ ہو تو ہر شخص اپنے زمانۂ حکومت میں مستبد بن جاتا ہے یاد رکھئے! جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے اگر وہ اپنے اس فریضے کی انجام دہی سے قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔"

(INTERPRETTERS OF MAN)

انیسویں صدی میں لکھا گیا ہے اور آج فرانس کا مفکر رینے گینو (RENE GUININE) لکھتا ہے "اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات میں سے ہے اور جو نہ پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرنا ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی۔ حاکم اور محکوم کا تعلق دو الگ الگ عناصر کے وجود کا متقاضی ہے۔ اگر حاکم نہیں تو محکوم بھی نہیں۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت و اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے پر حاکم ہیں۔ عام رائے شماری کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے" (CRISES OF MODERN WORLD) — (IRWING BARBIT) کہتا ہے: "جمہوریت نظری اعتبار سے تو اپنے آپ کو مشاہدات میں محسوب کر سکتی ہے لیکن عملی طور پر یہ ایک ناممکن نظریہ ہے"

(H. J. MENCKIN) مینکن اپنی کتاب (TREATISE ON RIGHT AND WRONG) میں لکھتا ہے "انسان کی سب سے بڑی ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں بہت سی ایسی جو نہایت لطیف اور معقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں لیکن جب ان کی عملی تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس نکلا۔ ان تمام ناکامیوں کا موجب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا ذکر کیجئے تو اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور حکام جماعت کے خادم ہیں۔ لیکن در حقیقت حکومت کا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں بلکہ سلب و نہب ہوتا ہے۔ اس باب میں مختلف اسالیبِ حکومت میں سب سے زیادہ ناکام نظام جمہوریت رہا ہے۔"

جمہوری نظام کے اربابِ حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد ملوکیت پر مبنی ہوا ہے لیکن ان کا جذبہ

مگر کسی معقولیت پسند نہیں ہوتا ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈال سکے اس کا ساتھ دیا جائے چنانچہ اس ہتھکنڈے سے وہ ان لوگوں کے توسط سے جو فی الحقیقت پبلک کے دشمن ہوتے ہیں غیر محتتم مدت تک برسرِ اقتدار رہتے ہیں۔"

یو۔این۔او کی تحقیقاتی کوشش

UNESCO سنہ ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض کے لئے مقرر کی کہ وہ جمہوری اندازِ حکومت کے متعلق سرکاری طور پر چھان بین کرے۔ اس چھان بین کا نتیجہ انہوں نے ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا جس کا نام ہے (DEMOCRACY IN A WORLD OF TENSION) اس کمیٹی نے دنیا بھر کے مفکرین اور مدبرین کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ جمہوریت کا مفہوم کیا ہے؟ جوابات کی اکثریت میں اعتراف کیا گیا کہ یہ لفظ مبہم ہے اور آج تک اس کا مفہوم بھی متعین نہیں ہو سکا۔

اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ آیا اکثریت کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا ہے، اور اس کے خلاف احتجاج کرنا جمہوریت کے خلاف ہے؟ اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلے کے خلاف ایجی ٹیشن کرے اور اکثریت کے سابقہ فیصلے کو بدلوا ڈالے۔

یہ ہے موجودہ دور کے مفکرین و مدبرین کی فکری کاوش کا ماحصل۔

ایک خود فریبی یا جمہوریت

حقیقت یہ ہے کہ نظری اعتبار سے یہ کتنا ہی خوش آئند کیوں نہ ہو عملاً جمہوری نظام کسی صورت میں جمہوری نہیں ہو سکتا۔ اس کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس میں حاکم اور محکوم کی تمیز مٹ جاتی ہے حالانکہ ایک مغربی مفکر کے قول کے مطابق حکومت ہر طبقہ کی محکوم طبقہ کے خلاف ایک سازش ہوتی ہے۔ غور کیجئے کہ بالفرض انتخابات کے وقت میں ایک شخص کے حق میں ووٹ دیتا ہوں اس ووٹ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ امیدواروں میں سے میرے نزدیک یہ شخص بہتر ہے میرے اس فیصلے سے نہ تو وہ شخص پوری قوم میں سے بہترین فرد بن سکتا ہے اور نہ ہی وہ شخص ہر معاملہ میں میری منشا کی تعبیر کر سکتا ہے۔ اسکے علاوہ وہ شخص جب ایک مسئلہ پر رائے دیتا ہے تو ناممکن ہے کہ اس مسئلہ پر وہ اپنے ہر ووٹر کی رائے کی نمائندگی کر سکے۔ لہٰذا منتخب شدہ ممبران کے متعلق یہ کہنا کہ ہر مسئلہ میں ان کی رائے درحقیقت ان لوگوں کی رائے ہے جنہوں نے اس کے حق میں ووٹ دیا تھا انسانی فکر و ارادہ کے متعلق بڑی خود فریبی ہے۔

جمہوری نظام کی دوسری بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں اقلیت کو اکثریت کا محکوم ہونا پڑتا ہے حالانکہ کسی اصول کے تحت یہ درست نہیں کہ کسی جگہ کی اکثریت کو یہ حق دے دیا جائے کہ وہ جو جی میں آئے کرے اقلیت ... حال ...

ماننا پڑے گا اور اس فیصلے کو بدلوانے کے لئے ایک ہی آئینی شکل اختیار کرنی پڑے گی اور وہ یہ کہ اقلیت کسی نہ کسی طرح اکثریت میں تبدیل ہو جائے۔ جمہوریت کی تیسری سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس نظام میں حق و باطل کے لئے کوئی مستقل خارجی معیار نہیں ہوتا بلکہ حق وہ ہے جسے ۱۰۰ میں سے ۵۱ حق کہہ دیں ....

اور باطل وہ جس کی ۱۰۰ میں سے صرف ۴۹ تائید کر سکیں جن ۵۱ نے ایک مرتبہ ایک چیز کو حق کہا ہے وہی دوسری مرتبہ اسے باطل قرار دے دیں تو وہ باطل ہو جائے گی چنانچہ جمہوری نظام میں مستقل اقتدار کا تصور نہیں ہوتا اس لئے سیاست اخلاقیات سے الگ رہتی ہے۔ برادران! جمہوریت کے متعلق مغربی مفکرین کی آراء آپ نے ملاحظہ فرمالیں لیکن اس کے برعکس ہمارا INTELLIGENTSIA اور عوام دونوں جمہوریت کا نام اس انداز سے لیتے ہیں جیسے اسے کوئی آسمانی سند حاصل ہے۔ ان کے نزدیک مغربی جمہوریت ایسی مقدس شے ہے کہ اس کے خلاف ایک لفظ سننا گوارا نہیں کرتے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں وہ اسے مقدس اس لئے سمجھتے ہیں کہ اس کے مقابلے میں ان کے سامنے ڈکٹیٹرشپ کا تصور ہوتا ہے کسی اقتدار اعلیٰ کا تصور نہیں ہوتا۔

اسلام اور مغربی جمہوریت

خارجی اقتدار اعلیٰ ہی اسلامی طرز حکومت کی بنیاد ہے۔ اسلام اس معنی میں جمہوری نظام نہیں جس معنی میں اس اصطلاح کو مغرب میں استعمال کیا جاتا ہے۔ دراصل قرن اول کے بعد مسلم ممالک میں ملوکیت کا دور رہا اور چونکہ شخصی حکومتیں استبداد کا مجسمہ ہوتی ہیں اس لئے یہی صورت حال مسلم ممالک کے اندر رہی اور جب یورپ نے اپنے ہاں جمہوریت کو رواج دیا تو چونکہ یہ نظام شخصی حکومتوں کے مقابلے میں بہتر تھا اس لئے دنیا کے ہر حصے میں اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ اور چونکہ اسلامی نظام اس عرصے میں مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا اس لئے وہ بھی ہمنوا ہو گئے جب قومیں زوال پذیر ہو جاتی ہیں تو ان میں احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو ترقی پسند ظاہر کرنے کے لئے اعلان کر دیا کہ اسلام جمہوری نظام حکومت سکھاتا ہے اور یہ نہ سوچ سکے کہ مغرب کا جمہوری نظام اسلامی نظام سے الگ شے ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں مغربی جمہوری نظام میں آخری فیصلہ کا حق اکثریت کو ہے۔ اس نظام میں نہ کوئی چیز مطلق حق ہے نہ مطلق باطل ہے لیکن دوسری طرف اسلام حق و باطل کے لئے مستقل اور مطلق معیار مقرر کرتا ہے جس چیز کو اس معیار نے صحیح قرار دیا وہ ہمیشہ صحیح رہے گی چاہے ۹۹ فیصد انسان اسے باطل قرار دے دیں۔ قرآن کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ حق اپنی ذات میں حق ہوتا ہے اگر وہ لوگوں کے خیالات کا تابع ہو جائے تو کائنات میں فساد بپا ہو جائے مغربی جمہوریت کا نظریہ یہ ہے کہ حق اور باطل کے تعین میں اکثریت کبھی غلطی نہیں کر سکتی حالانکہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ نوع انسانی کی اکثریت عام طور پر صحیح راستہ پر نہیں ہوتی اور قرآن اس تاریخی شہادت کی تائید کرتا ہے۔ اور واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ النَّاسِ عَنۡ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوۡنَ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ

انسانوں کی اکثریت کبھی حق پر اکٹھی ہی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ کہ اگر حق پر اکٹھی ہو بھی جائے تو حق کو پرکھنے کا معیار یہ نہیں کہ چونکہ اکثریت اس پر جمع ہو گئی ہے اس لئے یہ حق ہے۔ حضور نبی اکرمؐ اس وقت بھی حق پر تھے جب کہ ان کی تائید کرنے والا بھی کوئی دوسرا شخص نہ تھا اور پوری کی پوری اکثریت ان کے مخالف تھی۔ اگر اسلام مغرب کے مفہوم کے اعتبار سے جمہوری نظام ہوتا تو حق وہی قرار پاتا جس کی تائید کفارِ مکہ کر رہے تھے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں قرآن کریم نے ایسے اصول متعین کر دیئے ہیں جو تمام نوعِ انسانی کے لئے غیر متبدل ہیں یہ اصول اسلامی معاشرے کے تمام بنیادی خط و خال متعین کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان اصولوں کے متعلق یہ تصور ہی غلط ہے کہ ان کے صحیح یا غلط ہونے کے لئے رائے شماری کی جائے۔ اس لئے اسلامی نظام کا یہ حصہ جمہوری یا غیر جمہوری تصورات سے یکسر الگ اور بلند ہے البتہ ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانے کی ملتِ اسلامیہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین خود مرتب کرے گی اور قوانین کی تنفیذ کے لئے ایک مشنری وضع کرے گی۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کے لئے قرآن مشاورت کا حکم دیتا ہے لہٰذا اس حد تک اسلام ایک مشاورتی نظام ہے چنانچہ اسلامی نظام (PERMANENCE AND CHANGE) کا حسین امتزاج ہے خود حضور نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے حضور روزمرہ کے معاملات میں ہر اہم مرحلہ پر صحابہ کرامؓ سے مشاورت فرماتے تھے اور باہمی مشاورت سے بات طے پاتا اس کے احکام نافذ کرتے تھے۔

اسلامی مملکت کے سربراہ کا مقام

لیکن اس ضمن میں ایک اہم سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ اسلامی مملکت کا سربراہ کس حد تک اپنی مجلسِ مشاورت کے فیصلوں کو قبول کرتا ہے۔ اور کیا وہ اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اپنی کیبنٹ کے کسی فیصلے کو (VETO) کر دے۔ اس مسئلے میں حضورؐ کی زندگی سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے حضورؐ نے قریباً ہر اہم مسئلے پر اپنے مشیروں کے فیصلے کو اہمیت دی مثال کے طور پر جنگِ بدر میں حضور نبی اکرمؐ نے جب ایک مقام پر ڈیرا ڈال دیا تو حبابؓ بن منذر ایک صحابی نے دریافت کیا کہ آیا اس مقام کا انتخاب حضورؐ نے وحی کے اشارے پر کیا ہے یا اپنی رائے سے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ وحی کا حکم نہیں اس پر حضرت حبابؓ بن منذر نے عرض کیا کہ پھر اس مقام کی نسبت فلاں مقام زیادہ مناسب ہے ہمیں وہاں جا کر اپنا مورچہ بنانا چاہیے۔ حضورؐ نے ان تمام پہلوؤں پر غور کیا جو حضرت حباب نے پیش کئے تھے اور فرمایا کہ حبابؓ کی رائے زیادہ صائب ہے چنانچہ آپ نے اسی پر عمل فرمایا رات کو جب بارش ہوئی اور تائید غیبی نے جنگ کا نقشہ بدل دیا تو معلوم ہوا کہ اس صحابیؓ کی رائے کس قدر صحیح تھی۔ اسی طرح جنگِ احد کے موقع پر حضورؐ نے اکابر صحابہ سے رائے طلب کی۔ انہوں نے رائے ظاہر کی کہ عورتوں کو قلعوں میں بھیج دیا جائے اور خود شہر کے اندر (DEFENSIVE POSITION) اختیار کی جائے لیکن نوجوانانِ ملت (OFFENSIVE) پر آمادہ تھے چنانچہ

ان کے اصرار کی بنا پر حضورؐ نے بھی شہر سے باہر نکل کر لڑنا منظور کیا۔

اسی طرح غزوہ خندق میں جب دشمن کی فوج کا محاصرہ طویل ہو گیا تو مشکلات کے ہجوم کے پیشِ نظر حضورؐ کو خیال گذرا کہ کہیں انصار ہمت نہ ہار جائیں کیونکہ وہ اس قسم کی جنگ کے عادی نہ تھے اس لئے آپ نے چاہا کہ غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کر لیا جائے کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث ان کو دے دیا جائے چنانچہ رؤسائے انصار سے مشورت طلب کی گئی انہوں نے عرض کیا کہ حضورؐ اگر یہ فیصلہ وحی کے حکم کی رو سے ہے تو کسی کو انکار کی مجال نہیں لیکن اگر حضورؐ اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہم معافی چاہتے ہیں ہم اس کے لئے تیار نہیں حضورؐ انصار کے اس استقلال سے بہت خوش ہوئے اور ان کی رائے کو قبول فرمایا۔ اسی طرح اور بہت سے مواقع آئے جہاں حضورؐ نے اپنی مجلس مشاورت کے فیصلوں پر عمل کیا۔ لیکن ایک موقع ایسا بھی ہے جہاں حضورؐ نے صحابہ کرام کے فیصلے کو ویٹو کیا۔ یہ تھا صلح حدیبیہ کا موقع۔ مسلمان اس صلح سے بہت دل شکستہ تھے اور ان کے نزدیک صلح کا معاہدہ اعتراف شکست تھا لیکن اس کے باوجود حضورؐ اپنے فیصلے پر دو ٹوک قائم رہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کا سربراہ عام طور پر اپنے مشیروں کی رائے کا احترام کرتا ہے لیکن اگر کسی موقع پر وہ سمجھتا ہے کہ مشیروں کی رائے درست نہیں تو اسے حق حاصل ہوتا ہے کہ اسے ویٹو کر دے لیکن یاد رکھئے اسلامی مملکت کے سربراہ کے ویٹو کرنے میں اور ایک ڈکٹیٹر کے حکم میں فرق ہے ڈکٹیٹر اپنے فیصلے سے برتر کسی اتھارٹی کو تسلیم نہیں کرتا لیکن اسلامی مملکت کے سربراہ کا فیصلہ قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کے تابع ہوتا ہے اس کا ویٹو صرف جزئیات تک محدود ہے غیر متبدل اصولوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

نبی اور ایک عام سربراہِ مملکت

اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے ایک نبی ایک عام شخص کے سربراہِ مملکت ہونے میں فرق ہے کیونکہ ایک عام انسان اگر سربراہِ مملکت بنتا ہے تو ممکن ہو سکتا ہے بلکہ فی زمانہ اغلب ہے کہ اس کی بصیرت قرآنی ناقص ہو اور وہ نہایت دیانتداری سے اپنے کسی فیصلے کو قرآن کریم کے مقرر کردہ حدود کے اندر سمجھتا ہو لیکن وہ دراصل ایسا نہ ہو۔ یا بصورت دیگر اس کے جذبات اس کے فیصلے پر اثر انداز ہوں۔ ایسی صورت میں اگر کیبنٹ یا پارلیمنٹ یہ سمجھتی ہے کہ سربراہِ مملکت کا فیصلہ قرآن کریم کے اصولوں سے ٹکراتا ہے تو پھر کیا کیا جائے؟

اس کے حل کی یہی صورت نظر آتی ہے کہ سربراہِ مملکت اور پارلیمنٹ کے اختیارات کے حدود مقرر کئے جائیں

اور اس کے بعد اگر کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ ہو تو اسے ایک عدالت کے سامنے پیش کیا جائے۔

مندرجہ بالا حقائق اور واقعات بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ پاکستانی (INTELLIGENTSIA) اور عوام مسئلہ جمہوریت پر توجہ دیں۔ مغربی مفکرین کی جمہوریت کے متعلق آراء بھی ان کے سامنے ہیں اور عملی طور پر جمہوریت نے جو نتائج پیدا کئے ہیں وہ بھی ان کے سامنے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم عوام کو صحیح اسلامی جمہوریت کا تصور دیں اور مغربی جمہوریت کے نتائج سے آگاہ کریں۔ ایک عام شخص جمہوریت کا راگ جب الاپتا ہے تو ڈکٹیٹر شپ کی برائیاں اس کے سامنے ہوتی ہیں وہ صرف مغربی جمہوریت اور ڈکٹیٹر شپ کا موازنہ کرتا ہے۔ اسلامی نظام کا نقشہ اور اس نظام نے حضورؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں جو نتائج پیدا کئے تھے وہ ان کے سامنے نہیں ہوتے۔ البتہ بعض علمائے کرام و مفسرین قرآن کی بات، دوسری ہے اسلامی نظام کا نقشہ تو ان کے سامنے ہوتا ہے لیکن وہ عوام کی نظروں سے اسے اوجھل رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ مغربی جمہوریت فی زمانہ ان کی مذہب برادری کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ مسجد کا پلیٹ فارم ان کے ہاتھ میں ہے جہاں سے ہر وقت وہ عوام کو اپنے خود ساختہ مذہب سے متاثر کر سکتے ہیں۔ اور چونکہ مغربی جمہوریت میں فیصلہ اکثریت کے ہاتھ میں ہوتا ہے (چاہے وہ فیصلہ قانونِ خداوندی کی رو سے صحیح ہو یا غلط!) اور اکثریت کی ذہنیت کا کنٹرول سوئچ ان کے ہاتھ میں ہے اس لئے مغربی جمہوریت ان کے مزاج کے عین مطابق ہے اور وہ پورے زور سے اس کی وکالت کرتے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد بارہ برس تک جمہوریت نے اس ملک میں جو گل کھلائے ہیں وہ بھی آپ کے سامنے ہیں۔ ابھی ابھی بنیادی جمہوریت کے انتخابات ہوئے ہیں ان میں جو عوام کے نمائندے منتخب ہو کر سامنے آئے ہیں ان میں خال خال ایسے نظر آتے ہیں جو حقیقت میں کوئی اپنی رائے رکھتے ہوں عام طور پر سنجیدہ اور فہمیدہ لوگ نہ صرف یہ کہ بطور امیدوار کھڑے نہیں ہوتے بلکہ پولنگ سٹیشن پر جانا بھی پسند نہیں کرتے۔ جب صورت حال یہ ہو تو ان منتخب شدہ لوگوں کی وساطت سے جو اسمبلیاں اور حکومتیں بنیں گی ان کا تصور آپ کر سکتے ہیں۔ سوچئے کہ جس سطح کے لوگ عوام کے نمائندے بن کر سامنے آتے ہیں ان میں کوئی ملکی مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

ایک مضبوط شخصیت کی ضرورت

اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر جگہ ایک قابل اور مضبوط انسان ہی مسائل حل کرتا ہے بیشک ہندوستانی مسلمانوں کے اندر جذبہ اور جوہر دونوں موجود تھے لیکن جب تک قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم سامنے نہیں آئے قوم کے لئے راستہ متعین نہیں ہو سکا اسی طرح مصر، الجزائر اور انڈونیشیا میں جب تک ناصر۔ بن بیلا اور سیکارنو سامنے نہیں آئے یہ قومیں قعرِ مذلت سے نکل نہ سکیں۔ گزشتہ جنگِ عظیم میں انگلستان پر مایوسی کے بادل گھرے سے اور یہ چرچل کی شخصیت تھی جو قوم کی کشتی کو بھنور سے نکال کر لے گئی۔ شخصیتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سوال صرف

وحی کی روشنی میں ان پر حدود و قیود مقرر کرنے کا ہے۔

حدود و قیود کی ضرورت

جس آزادی کے طلب گار آج پاکستان کے بعض عوام ہیں یا جو آزادی کا تصور چند خود غرض مولوی اور لیڈر عوام کے ذہنوں میں بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ اپنی اصل اور بنیاد کی رُو سے غلط ہے۔ انسان حدود و قیود کے بغیر صحیح زندگی نہیں گزار سکتا اور نہ ہی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو سکتا ہے اگر سڑک پر سے ٹریفک کنٹرول ہٹا کر ہر موٹر ڈرائیور اور ہر سائیکل سوار کو کھلی چھٹی دے دی جائے کہ جدھر جی چاہے اور جس طرح جی چاہے چلے اور پیدل سوار کو اجازت ہو کہ چاہے سڑک کے دائیں چلے، بائیں چلے یا درمیان میں چلے تو اس کا جو نتیجہ ہوگا اس کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں حالانکہ سڑک پر چلنے والے لوگوں کی اکثریت باشعور انسانوں کی ہوتی ہے۔ معاملہ صرف سڑک تک ہی محدود نہیں انسانی زندگی کے کسی شعبے میں انسان کو کھلی چھٹی دے دی جائے حال یہی ہوگا۔ ایک عدالت کی کرسی اور حکومت کی گدی پر بیٹھنے والوں سے زیادہ باشعور کون ہو سکتا ہے لیکن اُنہوں نے بھی بے لگام ہو کر جو گُل کھلائے ہیں تاریخ انسانی ان مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک بچے کو اگر کھلی چھٹی دے دی جائے تو اپنے اعمال و حرکات سے خود بخود تباہ ہو جائے گا اسے بعض باتیں سکھانے اور بعض سے روکنے کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ آئندہ زندگی وہ خوشگوار طریقے سے گزار سکے۔ یہی حال پوری انسانیت کا ہے انسانیت کو ارتقائی منازل میں سے بخیر و خوبی گذرنے کے لئے ہر وقت کنٹرول کی ضرورت ہے۔ جس طرح بچے کی ابتدائی زندگی کا کنٹرول اس کا مستقبل میں محافظ و ضامن بن جاتا ہے اسی طرح انسانی معاشرہ کا کنٹرول قوموں کے ڈسپلن کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور جو حدود و قیود پہلے باہر سے عائد کئے جاتے ہیں انسان ان کو خود بخود اپنے اوپر عائد کرنے کے قابل ہو جاتا ہے پہلے کنٹرول اور اس کا نتیجہ ڈسپلن ہے اس سے قوموں کے مدارج بلند ہوتے چلے جاتے ہیں دوسری طرف ایک (UN-DISCIPLINED) قوم کو بغیر کنٹرول کے چھوڑ دینا تباہی کا موجب بن جاتا ہے۔

مادر پدر آزادی کا تصور سرے سے غلط ہے۔ اگر انسان مادر پدر آزاد ہوتا تو نہ وحی کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی نہ حکومتیں قائم کرنے کی۔ حکومت قائم ہی اس لئے کی جاتی ہے کہ حدود و قیود نافذ کرے۔

سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ نافذ کرنے والی حکومت بھی مادر پدر آزاد نہ ہو۔ وہ حکم اس چیز کا دے جو اللہ کے قانون کے مطابق (LAW-FULL) ہو اور منع اس چیز سے کرے جو اللہ کے قانون کے مطابق (UN-LAWFULL) ہو۔ یہی اسلامی حکومت کا فریضہ ہے اور یہی اس کا مقصد ہے۔ اور اسی میں قوموں کے مدارج کی بلندی کا راز ہے۔

قرآن کی طرف آیئے حکومت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نفاذ کا ذریعہ بنایئے۔ مغرب کی لادینی جمہوریت کا ابلیسی کھیل خود بخود ختم ہو جائیگا۔ اور جس مصیبت میں معاشرہ آج مبتلا ہے اس سے از خود نجات حاصل ہو جائے گی۔

غزل سرائے و نواہائے رفتہ باز آور

بایں فسردہ دلاں

حرفِ دلنواز

آور

پرویز صاحب کی تقریر

جس سے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ نومبر ۱۹۶۷ء
سے خطاب کیا

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت:- ۲۵ نئے پیسے

دو عالم را توان دیدن بمینائے کہ من دارم
کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم؟
مخور ناداں غم از تاریکئ شبہا کہ می آید
کہ چوں انجم درخشد داغ سیمائے کہ من دارم
ندیم خویش می سازی مرا، لیکن ازاں ترسم
نداری تاب آں آشوب و غوغائے کہ من دارم

مطبوعہ اشرف پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زمیلانِ قافلۂ قرآنی!

آپ پر ہزار ہزار سلام و رحمت ہو۔

میرا سرِ نیاز، بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہے کہ اس نے ایک بار پھر موقعہ بہم پہنچایا کہ خمخانۂ قرآنی کے بادہ نوش، اپنے سروں میں کیفِ صہبائے حجازی کی خرد فروزیاں، اور اپنے دلوں میں فطرتِ روح الامین کی سکون آمیزیاں لئے، وجہِ شادابیٔ محفل ہوئے ہیں۔ اس دور میں، جبکہ کشاکشِ حیات ایسی شدید، اور غمِ دوراں اسقدر گراں نشیں ہو رہا ہے، اس قسم کے فرصت کے چند لمحات کا میسر آ جانا جن میں کسی کی نشیدِ جانفزا پکار پکار کر کہہ رہی ہو کہ۔

اُس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو — زندگی کتنی خوبصورت ہے

از بس مغتنمات میں سے ہے۔ آیئے ہم، ان چند لالہ رنگ و نشاط آہنگ ساعتوں میں، جنہیں ہم نے سورج کی کرنوں سے نچوڑ کر اپنی مٹھی میں دبا رکھا ہے، خدائے عظیم کی اُس کتاب جلیل کا تذکرۂ حسین و جمیل کریں جس کے متعلق صبحِ بہارِ کائنات کی ہر رنگینی کا تبسمِ پنہاں، اس رازِ فطرت کی غمازی کر رہا ہے کہ

یہ غنچوں کی رنگت، یہ پھولوں کی نکہت --- اُسی کا تبسم اُسی کے اشارے

اور قدح برداراںِ ساقیٔ کوثر و تسنیم، انتہائی جذب و کیف کے عالم میں، ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ

دوستو! اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر۔ گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام

میرے عزیز رفیقو! ہم آج قریب ڈیڑھ سال کی طویل مدت کے بعد مل رہے ہیں۔ اس دوران میں کچھ میری مسلسل علالت، اور کچھ دیگر نامساعد حالات کی وجہ سے، جن کے تذکرۂ جگر سوز سے میں آپ کی اس محفل کیف و نشاط کو افسردہ و پژمردہ نہیں کرنا چاہتا، ہماری تحریک قدرے نرم رو ہو گئی۔ لیکن میں سمجھتا

ہوں کہ ہم اب اس وادیٔ پُرخار سے آگے نکل آئے ہیں، اس لئے اب ہم اپنے نئے عزائم اور تازہ ولولوں سے، بتوفیقِ ایزدی، اس کمی کو جلد پورا کر لیں گے۔ لیکن، برادرانِ گرامی قدر! قبل اس کے کہ ہم اپنا سامانِ سفر تازہ کر کے پھر جادہ پیمائے منزل ہوں، ضروری ہے کہ ہم قرآن کی شمع نورانی کی روشنی میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں اور دوسری طرف خود اپنا احتساب کریں —— اس لئے کہ جو راہ رَوِ سفرِ زندگی میں احتسابِ خویش نہیں کرتے اور گرد و پیش پر نگاہ نہیں رکھتے، وہ اپنے آپ کو رہزنوں کی تاراج سے محفوظ، اور کیسہ تراشوں کی چابکدستیوں سے مامون تصور نہیں کر سکتے۔ رہروانِ سفرِ حیات کی نگاہیں بالعموم اُن مخالفین کی طرف اٹھتی ہیں جو للکار کر سامنے آتے اور پکار کر حملہ کرتے ہیں لیکن قرآن کریم ان کھلے دشمنوں سے کہیں زیادہ نقصان رساں اور تباہ کن اُن فتنہ پرور عناصر کو قرار دیتا ہے جو

ایک خطرناک گروہ

رفاقت کے نقاب میں اس قافلہ میں شامل ہوں۔ خدمت و ایثار کے بہروپ میں اپنے ساتھیوں کا اعتماد حاصل کریں اور انتہائی نازک مرحلہ پر اُن کی متاعِ حیات پر شبخون ماریں۔ آپ دنیا کی تاریخ —— اور انتہائی ندامت سے، سر جھکا کر کہنا پڑتا ہے کہ خود مسلمانوں کی تاریخ —— پر نگاہ ڈالیں۔ آپ دیکھیں گے کہ کسی تحریک کو غیروں کے ہاتھوں اسقدر نقصان نہیں اٹھانا پڑا جسقدر تباہی کا موجب خود "اپنوں" کی فتنہ سامانیاں بنی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اپنے اولیں اوراق میں، ان دو جماعتوں کے اجمالی تذکرہ کے بعد، جو کھلے بندوں اس کی دعوت پر ایمان لائیں یا دھڑلے سے اس کی مخالفت کرتی ہیں، اس گروہ کا ذکر تفصیل سے کرتا ہے جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (۲/۸)

وہ دعوے تو یہ کرتے ہیں کہ وہ "مومن ہیں"۔ لیکن درحقیقت وہ مومن ہوتے نہیں یہ اُن کا صرف زبانی دعوےٰ ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہوتے ہیں جو اس جماعت کے اندر داخل ہوتے ہی تخریب کے لئے ہیں، اور کچھ ایسے جو اپنے خاص مقاصد لے کر ان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ اپنی دانست میں "خدا اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دیتے ہیں" لیکن درحقیقت —۔ وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ (۲/۹)۔ وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔ اس لئے کہ وہ جذبات کی رو میں بہے چلے جاتے ہیں اور جب انسان پر جذبات غالب آجائیں تو اس کی عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔ ان کے دلوں میں روگ ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ نفاق درحقیقت نفسیاتی مرض

نفسیاتی مرض

ہے جس سے انسان اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتا ہے اور بظاہر سمجھتا یہ ہے کہ وہ بالکل صحیح راستے پر چل رہا ہے۔ (اس مرض کی تفصیل ذرا آگے چلکر سامنے آئے گی)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ۔ تم تخریبی کاروائیاں مت کرو۔ خواہ مخواہ فساد پیدا نہ کرو۔ تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ یہ کیا کہا آپ نے! ہم فساد پیدا کرتے ہیں؟ ہمارے جیسا اصلاح کرنے والا اور کون ہے۔ ہماری ہر تدبیر معاملات کو سنوارنے اور اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ہے۔ فساد تو وہ پیدا کرتے ہیں جو ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اٰمِنُوْا کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ۔ اگر تم اصلاح کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو پھر ان لوگوں جیسی روش اختیار کرو جو اس تحریک کے ساتھ ہیں۔ تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ یہ تو شخصیت پرستوں کا گروہ ہے جو اندھی عقیدت میں بہے چلے جا رہے ہیں، ہم ان جیسے احمق تھوڑے ہیں۔ اور قرآن کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ (۲/۱۳)۔ یاد رکھو! سب سے بڑے احمق یہ خود ہیں؛ لیکن اس بات کو سمجھتے نہیں، اس لئے کہ یہ جذبات سے کام لیتے ہیں۔ علم و عقل سے نہیں لیتے۔

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیوں ایسا کرتے ہیں؟ قرآن نے دو آیتیں آگے جاکر اس سوال کا نہایت واضح جواب دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ۔ یہ وہ لوگ

کاروباری ذہنیت

ہیں جو اس تحریک میں کاروباری ذہنیت لے کر داخل ہوئے تھے۔ بس اس ایک نقطہ میں ساری تفصیل سمٹ کر آجاتی ہے۔

قرآنی تحریک کی پوری عمارت للہیت کی بنیادوں پہ استوار ہوتی ہے۔ للہیت کے معنی یہ ہیں کہ اس میں داخل ہونے والے کے سامنے صرف ایک مقصد ہو۔ یعنی اِس دعوت اور تحریک کا فروغ اور کامیابی؛ اور اس کے ذریعے سے اپنی اصلاحِ نفس۔ اس میں شامل ہونے والے کی ذہنیت یہ ہونی چاہیئے کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْكَ لَهٗ (۶/۱۶۲)۔ میرے فرائضِ منصبی اور ان کی بایں حسن وخوبی ادائیگی؛ یہ میرا تمام کاروبارِ حیات۔ میری زندگی اور میری موت۔ سب اس پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے جو اس دعوت الی الحق کے سلسلہ میں مرتب کیا گیا ہے اس کے علاوہ کوئی اور مقصد میرے پیشِ نظر نہیں۔ اگر اس مقصد کے علاوہ کوئی اور جذبہ دل میں بیدار ہوگیا تو وہ للہیت نہ رہی۔ سودا بازی ہوگئی۔ یہی وہ سودا بازی ہے جس کے لئے مفاد پرست لوگ قرآنی تحریک میں شامل ہوتے ہیں۔ جب تک وہ دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ رہنے میں

ان کا فائدہ ہے، وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جب اس فائدے پر زد پڑتی ہے تو اس سے علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ اور اس علیحدگی کے وقت ان کے دل کا روگ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ لوگ اس تحریک کے لئے مہیب خطرہ اور تخریب کا موجب بن جاتے ہیں۔ علیحدگی کے وقت وہ اس کا اعتراف تو کسی حالت میں نہیں کرتے کہ ہم ہی میں کچھ نقائص اور کمزوریاں تھیں جن کی وجہ سے ہم اس تحریک کے ساتھ نہیں چل سکے —— اس قسم کے اعتراف کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (اگر ان میں جرأت ہوتی تو یہ منافق ہوتے ہی کیوں' یہ یا کھلے بندوں مومن ہوتے یا نکھرے ہوئے کافر۔ بین بین کی راہ تو اختیار ہی وہ کرتا ہے جو جرأت و بسالت سے عاری ہو۔ یاد رکھئے۔ کاروباری ذہنیت اور جرأت دو متضاد عناصر ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے)۔ یہ لوگ اپنی کسی کمزوری کا اعتراف نہیں کرتے۔ اب دوسری صورت یہی باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کریں۔ وہ ایسا اسی شکل میں کرسکتے ہیں کہ وہ اس تحریک میں کیڑے ڈالیں۔ اس کے ساتھ وابستہ رہنے والوں کو بدنام کریں۔ اس کے داعیان کے خلاف الزام تراشی کی مہم شروع کردیں' ان پر ذاتی حملے کریں۔ دنیا میں کہتے پھریں کہ ہم تو نہایت نیک نیتی سے اس تحریک میں شامل ہوئے تھے لیکن اندر جاکر معلوم ہوا کہ یہ سب دھوکا اور فریب ہے۔ اب جب ہم پر حقیقت حال منکشف ہوگئی ہے تو دیانتداری کا تقاضا ہے کہ ہم ان کا ساتھ چھوڑ دیں اور صحیح واقعات کی تشہیر کریں تاکہ دوسرے لوگ ان کے فریب میں نہ آسکیں۔ وہ یہ مہم شروع کردیتے ہیں' اور چونکہ سننے والے اتنی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ جو کچھ سنا ہے اس کی تصدیق تو کرالی جائے' ان کا پروپیگنڈا کامیاب ہوجاتا ہے

اس کا مفاد کیا ہوتا ہے

اس مقام پر ایک نہایت اہم اور نازک سوال سامنے آتا ہے اور جب تک اُسے سمجھ نہ لیا جائے' کاروباری ذہنیت کا صحیح اندازہ لگایا نہیں جاسکتا۔ ایک شخص قرآنی تحریک میں شامل ہوتا ہے۔ اپنی گرہ سے روپیہ خرچ کرتا ہے۔ دن رات اس کے کاموں میں لگا رہتا ہے۔ وقت اور توانائی صرف کرتا ہے۔ اغیار کے طعنے بھی سنتا ہے۔ اور اس کے معاوضے میں اُسے کچھ نہیں ملتا۔ نہ ہی کچھ ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ جب وہ تحریک سے الگ ہوتا ہے تو اس چیز کو اپنی وفا شعاری اور خلوص و صداقت کے لئے بطور ثبوت پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بتایئے کہ اگر مجھ میں خلوص نہیں تھا تو میں نے اتنا عرصہ اس قدر کام اور ایثار کیوں کیا؟ یہ بات بظاہر اسقدر وزنی نظر آتی ہے۔ کہ لوگ اس کے قائل ہوجاتے ہیں اور وہ یوں اپنے تخریبی مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ لیکن قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ للہیت کے مقابلہ میں انسان

کے پیشِ نظر مالی مفاد ہی نہیں ہوتے۔ اکثر و بیشتر ایک ایسا مقصد ہوتا ہے جس کے سامنے مال و دولت اور جاہ و منصب سب ہیچ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مقصد کسی کو نظر نہیں آتا۔ اسی کو وہ دل کا روگ

ایغو کی تسکین

یہ نفسیاتی مرض قرار دیتا ہے۔ اسے وہ "عزت الاثم" سے تعبیر کرتا ہے۔ دورِ حاضر کے علم النفس (سائیکلوجی) کی اصطلاح میں اسے (EGOISM) کہا جاتا ہے۔ جو حضرات انسانی نفسیات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بیماری کسقدر شدید۔ گہری اور خوفناک ہوتی ہے، اور اس کے نتائج کسقدر تباہ کن۔ ایغو، انسان کے پندارِ نفس کو کہتے ہیں۔ یعنی بڑا بننے کی ہوس۔ ایک شخص کو آپ دیکھیں گے کہ وہ جیب سے روپیہ بھی صرف کرتا ہے، اور پھر اجتماعات میں بیٹھا کبھی جھوٹے برتن صاف کر رہا ہے۔ کبھی جھاڑو دے رہا ہے۔ دریاں بچھا رہا ہے۔ کرسیاں اٹھا رہا ہے۔ لیکن مقصد اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ اُس کی تعریف کریں اور اس طرح وہ ان کی نگاہوں میں بڑا بن جائے۔ اس سے اس کا نفس موٹا ہوتا ہے، اس کے پندار کی تسکین ہوتی ہے۔ جب تک ایسا ہوتا رہے وہ اپنے آپ کو اس تحریک کا فدائی اور ادنیٰ درجہ کا خادم کہکر پکارتا ہے۔ لیکن جہاں ایسا ہوا کہ اس کے پندار کو ٹھیس لگی، اس کا ایغو انتقام پر اتر آیا۔ اور چونکہ اس سے عزت کا مقام چھین گیا ہوتا ہے اُسے انتقام کی لذت اسی صورت میں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کو ذلیل کرے۔ اس کے لئے وہ ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سے اس کے دل کی آگ بجھتی نہیں۔ اور بھڑکتی ہے۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (۲/۱۰)۔ وہ اپنے مرض کا علاج یہ سوچتے ہیں کہ دوسروں کو جھٹلایا جائے۔ لیکن اس سے اُس مرض کو افاقہ ہونے کے بجائے وہ اور بڑھتا ہے۔ اس کا صحیح علاج کیا ہے، اس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔

مدینہ کے منافقین

آپ ان احوال و کوائف پر نگاہ ڈالئے جو منافقین کے بارے میں قرآن میں مذکور ہیں تصریحاتِ بالا کی قدم قدم پر شہادت ملیگی۔ حضورؐ کی مکی زندگی میں منافقین کا ذکر نہیں ملتا۔ وہ لوگ بالعموم کمینہ فطرت نہیں تھے۔ اس لئے جس کا ساتھ دیتے تھے تو وہ بھی دل کی پوری کشادہ سے اور جس کی مخالفت کرتے تھے تو وہ بھی کھلم کھلا۔ لیکن مدنی زندگی میں ایسا نظر آتا ہے جیسے یہ لوگ گروہ در گروہ جماعتِ مومنین میں شامل ہوگئے۔ یاد رکھئے۔ یہ کوئی الگ گروہ نہیں تھا۔ یہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل تھے۔ خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے کے مدعی تھے اُنہی کے معاشرے کے افراد شمار کئے جاتے تھے۔ اُن کے اجتماعات میں شریک ہوتے تھے۔

ان کے تمام مشوروں میں اُن کے ہمراز بنتے تھے۔ غرضیکہ ایک مخلص مسلمان اور منافق میں (دل کی حالت کے سوا) کوئی اور تمیز نہ تھی۔ قرآن اس پر شاہد ہے۔ چنانچہ جب ان کی منافقت کا پردہ چاک ہوا تو قرآن نے اسے "کفر بعد از اسلام" (۹/۷۴)۔ یا ایمان کے بعد کفر (۹/۶۶) سے تعبیر کیا۔ انہوں نے جماعت میں اسقدر اعتماد پیدا کر لیا تھا کہ نبی اکرمؐ انہیں میدانِ جنگ تک میں ساتھ لے جاتے تھے، حالانکہ ظاہر ہے کہ میدانِ جنگ بڑا ہی نازک مقام ہوتا ہے۔ اس میں منافقین کی شرکت، جماعت کا تختہ الٹ کر رکھ دیتی ہے۔ جنگ بدر میں تو ان کا ذکر نہیں کیونکہ وہ مشتمل تھی السابقون الاولون پر۔ اس کے بعد جنگ اُحد میں ان کا ذکر ہے۔ جنگ احزاب میں ان کی ریشہ دوانیوں کو طشت از بام کیا گیا ہے۔ اور جنگ تبوک میں تو ان کی فتنہ سامانیاں انتہا تک پہنچ گئی تھیں۔ چنانچہ سورہ توبہ بیشتر انہی کے واقعات پر مشتمل ہے۔ ان کے اعتماد کا

دو خیال کے مسلمان

یہ عالم تھا کہ جب ان کی منافقت کا پردہ چاک ہوا اور ان کے خلاف کارروائی کرنے کی تجاویز سامنے آئیں، تو خود مسلمانوں میں دو پارٹیاں ہو گئیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ ان کے خلاف سخت اقدام کرنا چاہیے۔ دوسروں کی رائے تھی کہ نہیں! اتنی بڑی جماعت کو اس طرح کاٹ کر پھینک دینا ٹھیک نہیں۔ ہمیں ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے۔ سورہ نساء میں انہی دو مختلف الخیال پارٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ — فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ (۴/۸۸) تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم ان منافقین کے بارے میں دو پارٹیاں بن گئے ہو۔ جو لوگ انہیں ساتھ رکھنے کا مشورہ دیتے تھے ان سے کہا گیا کہ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ۔ کیا تم ان لوگوں کو راہ راست پر لانے کے ارادے رکھتے ہو جو قوانین خداوندی کو چھوڑ کر غلط راستے پر چل نکلے ہیں؛ تم انہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو اور وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً اور ان کی انتہائی خواہش یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے اس تحریک کا ساتھ چھوڑا ہے تم بھی اسی طرح اس کا ساتھ چھوڑ دو۔ تاکہ وہ اور تم برابر ہو جاؤ۔ (۴/۸۹)۔ ان کے علاوہ قرآن نے کچھ ایسے لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جو چاہتے تھے کہ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَ يَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ (۴/۹۱) مسلمانوں کی طرف سے بھی امن میں رہیں اور اپنی پارٹی کی طرف سے بھی۔ یعنی۔ با ما نماز کرد

الزام تراشی

و بہ زاہد شراب خورد۔ کی دوغلی پالیسی پر عمل کرنے والے۔ جب اس طرح ان لوگوں کی منافقت کا پردہ چاک ہوتا تو وہ الزام تراشیوں اور بہتان بافیوں

کے اوچھے اور کمینے ہتھیاروں پر اُتر آتے۔ پہلے وہ اُن لوگوں کے خلاف طعن و تشنیع شروع کر دیتے جو جماعت کا ساتھ نہ چھوڑتے۔ ان میں سے جو لوگ تحریک کے کاموں کے لئے کچھ صرف کرنے کے قابل ہوتے یہ ان کی نیتوں پر حملے کرتے۔ اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ۔ اور جو غریب صرف محنت سے جماعت کے کاموں میں حصہ لیتے، یہ اُن کا تمسخر اڑاتے۔ وَالَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ (9/79) جو لوگ اس جماعت کی مالی امداد کرتے ان سے جا جا کر کہتے کہ ان کی امداد مت کرو۔ یہ سب دھوکا باز اور فریب کار ہیں۔ هُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا (63/7) تم جب اس تحریک کی امداد نہ کرو گے تو یہ لوگ اس رسول کا ساتھ چھوڑ کر خود بخود تتر بتر ہو جائیں گے۔ ان کی اسکیم یہ بھی ہوتی کہ اپنے میں سے کچھ لوگوں کو تیار کرتے کہ وہ اس جماعت میں جا کر شامل ہو جائیں اور پھر ان میں بددلی پھیلا کر اُن سے الگ ہو جائیں تاکہ اس طرح اس جماعت کے کچھ افراد بھی ان کے ساتھ نکل آئیں۔

دوسری چالیں

یہ ان سے کہتے کہ اٰمِنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (3/72) تم صبح کے وقت ایمان کا نقاب اوڑھ کر ان کے ساتھ جا ملو۔ اور شام کو ان سے الگ ہو جاؤ۔ اس طرح شاید ان میں کے کچھ لوگ تمہارے ساتھ واپس لوٹ آئیں۔ پھر ان کی چال یہ بھی ہوتی کہ اس جماعت کے افراد سے الگ الگ ملتے اور انہیں جماعت سے بالا بالا انفرادی طور پر راضی کر لینے کی کوشش کرتے تاکہ اس طرح جماعت کمزور ہو جائے۔ یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِیُرْضُوْكُمْ۔ یہ تمہارے سامنے خدا کی قسمیں کھا کھا کر تمہارے ہمدرد اور بہی خواہ بنتے ہیں تاکہ تمہیں انفرادی طور پر اپنے ساتھ ملانے پر راضی کر لیں۔ ان سے کہا گیا کہ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ (9/62) اگر تم مومن ہو تو تمہارا جواب یہ ہونا چاہیئے کہ سوال ہماری انفرادی رضامندی کا نہیں۔ سوال اس نظامِ خداوندی کی رضامندی کا ہے۔ اگر وہ تمہیں معاف کر کے تم سے راضی ہو جائے تو ہم بھی تم سے راضی ہو جائیں گے۔ لیکن اگر تم اُسے راضی نہ کرو اور کوشش کرو کہ ہم اُس سے بالا بالا تم سے راضی ہو جائیں تو یہ بات ایمان کے منافی ہے یہ جماعت سے غداری ہے، جس کی کم از کم ہم سے توقع نہ رکھو۔

حضور پر ذاتی حملے

وہ اس سے بھی آگے بڑھتے اور خود اس تحریک کے داعی، حضور رسالتمآبؐ پر ذاتی حملے شروع کر دیتے۔ کبھی کہتے کہ یہ تو ڈکٹیٹر ہے۔

اپنی سی چلائے جاتا ہے۔ ہماری مانتا ہی نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو شکست پر شکست ہوتی چلی جا رہی ہے يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ۔ کہتے ہیں کہ ان معاملات میں ہمارا بھی کچھ عمل دخل ہے یا یہ اپنی من مانی ہی کرتا جائے گا۔ يَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ۔ یہ لوگ اس قسم کی باتیں کچھ اس انداز سے کرتے ہیں گویا ان کے دل میں تحریک کا بڑا درد ہے اور یہ اس سے مجبور ہو کر ایسے شکوے کرتے ہیں لیکن جو زہر ان کے دل میں بھرا ہے اسے ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ کہتے ہیں کہ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا (۳/۱۵۳)۔ اگر اس معاملہ میں یہ ہماری سنتا تو ہم اس طرح جنگ میں کبھی نہ مارے جاتے؛ لیکن وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۳/۱۵۳) خدا خوب جانتا ہے کہ ایسا کہنے سے ان کا درحقیقت منشاء کیا ہے۔ کبھی کہتے کہ هُوَ اُذُنٌ (۹/۶۱)۔ یہ بڑا کانوں کا کچا ہے۔ اپنی کوئی رائے ہی نہیں رکھتا۔ جو کچھ کسی نے آکر کہہ دیا اسے صحیح تسلیم کر لیا اور اس کے مطابق فیصلے دینے شروع کر دیئے۔ وہ یہاں تک بھی کہتے کہ اس پر وحی وغیرہ کچھ نازل نہیں ہوتی۔ نہ ہی اس میں خود اتنی قابلیت ہے کہ اس قسم کی باتیں اپنے ذہن سے کر سکے۔ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ (۱۶/۱۰۳)۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب کسی اور شخص کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ وہی آکر اسے سکھا جاتا ہے۔

انتہائی کمینگی

اس قسم کے کمینہ فطرت لوگوں کا آخری حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس داعیٔ انقلاب کے خلاف پیسے کے معاملہ میں الزامات لگا دیئے جائیں۔ غور فرمائیے کہ وہ ذاتِ اقدس و اعظم جسے زمانۂ قبل از نبوت میں لوگ امین کہہ کر پکارتے تھے۔ جس کے متعلق ہرقل کے دربار میں ابوسفیان جیسا سخت دشمن بھی اس کا اعتراف و اعلان کرتا تھا کہ ہم نے اس میں جھوٹ اور بددیانتی کی کوئی بات نہیں دیکھی۔ اس ذاتِ گرامی کے متعلق یہ بدنہاد مشہور کرتے تھے کہ آپ (معاذ اللہ) پیسے کے معاملہ میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ (۹/۵۸)۔ ان میں وہ بھی ہیں جو بیت المال کے روپے کے معاملہ میں بھی تجھ پر الزام لگاتے اور طعنے دیتے ہیں۔ غور کیجئے کہ ان باتوں سے حضور کا کلیجہ کس طرح چھلنی نہیں ہوتا ہوگا!

الزام تراشی کے نتائج

قرآن کریم نے الزام تراشی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا ہے کہ کسی شخص کو اسکے مقام سے گرانے، اور اسے اذیت پہنچانے اور

ذلیل کرنے کے لئے یہ سب سے زیادہ مؤثر حربہ ہوتا ہے۔ آپ اپنی روزمرہ کی زندگی پر غور کیجئے۔ آپ نہایت شرافت سے پُر اطمینان زندگی بسر کر رہے ہیں کہ ایک فتنہ جو آپ کے خلاف ایک الزام لگا دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ ایک منٹ میں اپنے مقام سے گر کر اس کی سطح پر آ جاتے ہیں اور ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ دنیا جہان کے کام چھوڑ کر اپنی مدافعت پیش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس میں جج کون ہوتا ہے؟ ہر وہ ایرا غیرا جو آپ سے پوچھے کہ اس الزام کی حقیقت کیا ہے۔ اگر آپ اس کے سامنے اپنی صفائی پیش نہیں کرتے اور معذرت کر دیتے ہیں تو وہ باہر جا کر مشہور کر دیتا ہے کہ یہ جھوٹا ہے۔ اگر سچا ہوتا تو اپنی صفائی پیش نہ کرتا؟ جب آپ صفائی پیش کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر نہایت معتبر بن کر کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک کچھ قصور اس (الزام لگانے والے) کا ہے کچھ ان کا ہے۔ جو زیادہ تفصیل میں نہیں جاتے وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ صاحب! کچھ تو بات ہوتی ہی ہے جس کی وجہ سے کسی پہ الزام لگتا ہے۔ یوں کس کا سر پھرا ہے کہ دوسروں کو مفت میں بدنام کرے۔ لیکن ہمیں اس جھگڑے سے کیا؟ پھر بہی خواہوں اور ہمدردوں کا گروہ باہر نکلتا ہے کہ ان دونوں میں مصالحت کی کوشش کی جائے۔ مصالحت کی کوشش کی بنیاد اس مفروضہ پر ہوتی ہے کہ غلطی دونوں سے ہوتی ہے

—— اور آپ کو معلوم ہے کہ ایسا سمجھنے اور کہنے کے لئے دلیل کیا ہوتی ہے؟ یہ محاورہ کہ صاحب! تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اس محاورے کو ایسے پیش کر دیا جاتا ہے گویا یہ قرآن کی آیت ہے۔ اور کہنے والا اتنا بھی نہیں سوچتا کہ جس آواز کو اس نے تالی کی آواز سمجھا تھا وہ کہیں طمانچے کی آواز تو نہ تھی جو کسی دراز دست نے کسی بے گناہ کے منہ پہ دے مارا تھا! بہرحال یہ مصالحت کرانے والے بلا تحقیق کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! غلطی دونوں سے ہوئی ہے۔

اب صلح جوئی اور امن پسندی کا تقاضا ہے کہ کچھ وہ ہٹے کچھ یہ بڑھیں۔ اور اگر یہ بڑھنے پر آمادہ نہیں ہوتے تو پھر ان کے اچھے بھی خواہ بھی ناراض ہو کر کوسنے لگ جاتے ہیں کہ بڑا ضدی واقع ہوا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ الزام تراشی کس قدر مؤثر حربہ

اور کیسا اذیت دہ نشتر ہے۔ قرآن کریم نے ان لوگوں کے متعلق کہا ہی یہ ہے کہ وَ مِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ (۹/۶۱) "ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو اذیت پہنچانا چاہتے ہیں" اذیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ روپے کی تقسیم کے متعلق الزام کے سلسلہ میں حضورؐ کو اپنی مدافعت پیش کرنی پڑی ــ غور فرمایئے! دنیا کا عظیم ترین انسان (علیہ التحیۃ والسلام) جس کے متعلق خود خدا شہادت دیتا ہے کہ وہ اخلاق کی بلند ترین سطح پر ہے ـ وہ مجمع کے سامنے اپنی بریت پیش کر رہا ہے کہ میں نے بد دیانتی اور بے انصافی سے کام نہیں لیا۔ پناہ بخدا! فتنہ پرور عناصر کی اذیت کوشیاں اس حد تک چلی جاتی ہیں!

مسجد ضرار

پھر تماشا یہ کہ یہ لوگ یہ سب کچھ کرتے لیکن اس کے باوجود اپنے آپ کو اس تحریک کا مخلص حامی بھی ظاہر کرتے۔ چنانچہ جب انہوں نے جماعت میں تفرقہ پیدا کرنے کی آخری اسکیم سوچی ہے تو اس کے لئے کوئی مخالف تحریک نہیں شروع کی۔ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کی ــ کوئی گرجہ یا بتکدہ نہیں بنایا۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ مسلمان کسی دوسری تحریک کے ساتھ وابستہ ہو نہیں سکتے۔ یہی وہ مسجد تھی جس کے متعلق قرآن نے کہا کہ وہ مسجد نہیں بلکہ كُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ (۹/۱۰۷)۔ یہ مسجد ایمان کا نہیں کفر کا مرکز ہے۔ یہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے کھڑی کی گئی ہے۔ یہ درحقیقت ایک کمین گاہ ہے اُن لوگوں کے لئے جو اس سے پہلے اس تحریک سے الگ ہو کر مقابلہ کے لئے کھڑے ہو گئے تھے لیکن انہیں کوئی مرکز نہیں ملتا تھا۔ وَ لَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى۔ ان سے پوچھو گے تو یہ قسمیں اٹھا اٹھا کر کہیں گے کہ ہمارا منشاء تحریک کی بھلائی کے سوا کچھ نہیں۔ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۹/۱۰۷) لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ سخت جھوٹے ہیں۔ چنانچہ اسی مسجد کے متعلق حضورؐ کو حکم ملا کہ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا (۹/۱۰۸) تم اس میں قدم تک بھی نہ رکھنا۔ اس مسجد کی بنیاد ریت کے ایسے ٹیلے پر رکھی گئی ہے جو اسے جہنم کے گڑھے میں لے کر گریگا۔ اور وہ جہنم کیا ہے؟ یہ کہ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ

الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَۃً فِیْ قُلُوْبِھِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُھُمْ (۹/۱۱۰) اس مسجد کی تعمیر ان کے دل میں پھانس بن کر کھٹکتی رہے گی اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھدیگی۔ چنانچہ اس مسجد کے متعلق تاریخ میں ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ کو بھیج کر اسے گرا دیا۔

جب اس قسم کے فتنہ پرور عناصر کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے تو اکثر لوگ کہتے ہیں کہ یہ لوگ اتنا لمبا عرصہ آپ کے ساتھ رہے۔ اُس وقت

اتنا عرصہ ساتھ رہے

تو آپ نے ان کے خلاف کچھ نہ کہا۔ اب انہیں منافق اور متفنی بتایا جا رہا ہے۔ آپ کو پہلے کیوں نہ پتہ چلا کہ یہ منافق ہیں۔ لیکن آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ حضورؐ نبی اکرمؐ کی بصیرت سے بڑھ کر دنیا میں کس کی بصیرت ہو سکتی ہے! پھر حضورؐ کے ساتھ صحابہ کبارؓ کی بھی پوری جماعت تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہوا کیا! یہ فتنہ پرور لوگ حضورؐ کے ہاتھ پر اسلام لاتے اور اس جماعت کے اندر رہتے سہتے تھے۔ ان کے معاشرے کا ایک جزو تھے۔ لیکن سوچئے کہ ان لوگوں کو پہچاننے اور جماعت سے نکالنے میں کتنا وقت لگا۔ حضورؐ کی مدنی زندگی کی کُل مدت دس سال کی تھی۔ اور غزوۂ تبوک حضورؐ کی حیات طیبہ کی آخری مہم تھی۔ جو ۹ھ میں واقع ہوئی تھی۔ یہ منافقین غزوۂ تبوک تک میں شامل تھے۔ اس کے بعد ان کے استیصال کُلی کا انتظام کیا گیا۔ یعنی حضورؐ اور جماعتِ صحابہؓ کو ان منافقین کی آخری پہچان کے لئے نو سال کا عرصہ لگ گیا۔ خدا نے کہدیا تھا کہ ہم وحی کے ذریعے ان کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتے کہ تم انکی پیشانیوں سے ان کے دل کی حالت معلوم کرلو۔ یہ چیز تمہیں ان کے اقوال و افعال اور اعمال و کردار ہی سے معلوم کرنی ہوگی۔ سورہ محمدؐ میں ہے وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ (۴۷/۳۰)۔ اور اعمال و کردار سے پہچاننے میں اتنا لمبا عرصہ لگ گیا۔ اور اس عرصہ میں یہ لوگ جس قدر خرابی کا موجب بنتے رہے، قرآن کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ لہٰذا کسی کا یہ کہنا کہ یہ لوگ اتنا لمبا عرصہ تمہارے ساتھ رہے، تم نے پہلے کیوں نہ کہا کہ یہ منافق ہیں، حقائق سے بے خبری کی دلیل ہے۔

منافقین کے خلاف جنگ

اس مقام پر پہنچکر اس گروہ کے متعلق حکم آیا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ

عَلَيْهِمْ (۹/۷۳) اے رسول! کفار اور ان منافقین کو ایک ہی صف میں شمار کرو۔ ان کے خلاف جنگ کرو۔ اور ان سے بڑی سختی کا سلوک کرو۔ غور کیجئے! وہی رسول جن کی امتیازی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۳/۱۵۸): یہ خدا کی رحمت تھی کہ تو ایسا نرم دل واقع ہوا ہے۔ اگر تو دل کا سخت ہوتا تو یہ لوگ تیرے اردگرد سے بکھر جاتے۔ یعنی جس رسول کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ وہ "غَلِيظَ الْقَلْبِ" نہیں اب اُسی سے کہا جا رہا ہے کہ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ اس پر ان لوگوں کو بھی غور کرنا چاہیئے جو نہایت ہمدردانہ انداز میں کہا کرتے ہیں کہ انسان کو سخت دل نہیں ہونا چاہیئے اور اپنے رفقاء کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کرنا چاہیئے۔ نہ تو رسول اللہ سے زیادہ کوئی نرم دل ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان "ساتھیوں" سے زیادہ لمبے عرصہ کا کوئی ساتھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس انگلی کے زخم کا علاج مرہم سے نہ ہو سکتا ہو اور وہ ناسور بنتا جا رہا ہو جس سے باقی جسم کے زہر آلود ہو جانے کا خطرہ ہو، اسے بالآخر کاٹ کر الگ کرنا پڑتا ہے۔ یہ ڈاکٹر کی سنگدلی نہیں ہوتی۔ علاج کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس رسولؐ سے یہی نہیں کہا گیا کہ وہ ان سے جنگ کرے۔ یہ بھی کہا گیا کہ ان سے ہر قسم کے معاشرتی تعلقات منقطع کرے۔

معاشرتی تعلقات کا انقطاع

معاشرتی تعلقات میں کسی کی موت پر تعزیت اور دعائے خیر آخری چیز ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے متعلق حکم دیا گیا کہ لَا تُصَلِّ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ (۹/۸۴) اگر یہ مر جائیں تو ان کے لئے دعائے خیر نہ کرو۔ کبھی نہ کرو۔ نہ ہی ان کی قبر پہ کھڑے ہو۔ یوں اس گروہ سے جماعت مومنین پاک اور صاف ہوئی۔ جماعتِ مومنین سے اس کا وعدہ کیا گیا تھا کہ تم میں سے بالآخر خبیث اور طیب الگ ہو کر رہیں گے۔ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (۳/۱۷۸) یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا جماعتِ مومنین کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس میں یہ اب ہے۔ وہ رفتہ رفتہ ایسا کریگا کہ خبیث اور طیب چھٹ کر الگ الگ ہو جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے وقت جماعتِ مومنین میں کوئی منافق نہیں رہا تھا۔ سب کٹ کر یا چھٹ کر الگ ہو چکے تھے۔

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ منافقین کو پہچاننے میں اتنا وقت لگتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ خود تو بر فطرت نہیں ہوتے لیکن وہ پارٹی بازی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

پارٹی کا ساتھ

یعنی وہ دل سے مانتے ہیں کہ ہماری پارٹی غلطی کر رہی ہے لیکن ان میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ پارٹی کا ساتھ چھوڑ دیں۔ اس لئے وہ ان تمام فتنہ سامانیوں میں منافقین کا ساتھ دیتے ہیں اور اسی وجہ سے تخریب کے جرم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے پارٹی بازی کو لعنت قرار دیا ہے۔ وہ تو اس باب میں اس حد تک جاتا ہے کہ اس جماعت میں شامل ہونے والوں سے کہتا ہے کہ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۔ اے ایمان والو! اگر تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ عزیز رکھیں تو تم انہیں بھی اپنا دوست مت بناؤ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۹/۲۳) جو کوئی تم میں سے انہیں اپنا دوست بنائے گا تو اس کا شمار بھی انہی ظالموں کے زمرے میں ہوگا۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۹/۲۴)۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ یا اولاد۔ تمہارے بہن بھائی یا بیویاں۔ تمہارے دیگر اہل خاندان۔ تمہارے مال و دولت، جسے تم اس محنت سے کماتے ہو۔ تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو۔ تمہارے مکانات جنہیں تم نے اپنی پسند سے بنوایا ہے۔ غرضیکہ دنیا کا کوئی رشتہ اور کوئی جاذبیت خدا اور رسولؐ اور اس کے راستے میں جہاد کے مقابلہ میں تمہیں زیادہ محبوب ہیں، تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ تمہارے متعلق خدا کا آخری فیصلہ آجائے۔ یاد رکھو! جو لوگ صحیح راستے کو چھوڑ کر کسی اور طرف نکل جاتے ہیں وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔

یہ ہے برادران عزیز! ایمان کا تقاضا اور خدا کا فیصلہ۔ کس قدر صحیح کہا تھا مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

یہ مقام انسانی کیریکٹر کی بہت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ ہم اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ نیک آدمی وہ ہے جو کسی کو بُرا نہ کہے۔ جو کسی کا دل نہ دکھائے۔ ایسے آدمی کی سب تعریف کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کی رُو سے نیک آدمی کا فریضہ اس سے کہیں آگے ہے۔ اور وہ ہے نہی عن المنکر۔ غلط بات سے دوسروں کو روکنا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کسی سے یہ کہنا کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہے، اور اسے اس راہ سے روکنے کی کوشش کرنا، اس سے عداوت مول لینا ہے۔ اس کے نزدیک بہت بُرا بننا ہے۔ اگر کوئی شخص اس طرح برا بننے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ کو مومن نہیں کہلا سکتا۔ خدا کی میزان میں اس کی ایسی نیکیوں کا پرِ کاہ جتنا بھی وزن نہیں جن سے مقصود یہ ہو کہ اسے سب اچھا جانیں۔ جب مومن کا فریضہ یہ ٹھیرا کہ وہ غلط کار کو غلط کاری سے روکے تو اُسے غلط کاروں کی دنیا میں برا بننے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ اسلامی معاشرہ میں (NEUTRAL) یا (INDIFFERENT) کا کوئی مقام نہیں۔ یہاں تو یا خدا کا بندہ بن کر رہنا ہوگا یا طاغوت کا۔ جس میں برائی کو روک کر برا بننے کی ہمت نہیں اس کے لئے اس سے بہتر نصیحت کوئی نہیں کہ

جا بیٹھ کسی غار میں۔ اللہ کو کر یاد

مرض کا علاج

میں نے شروع میں کہا تھا کہ قرآن کریم نے منافقت کو "دل کا مرض" قرار دیا ہے۔ یعنی (EGOISM) دوسری طرف اس نے اپنے متعلق کہا ہے کہ وہ شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ہے (۱۰/۵۷) یعنی دل کی بیماریوں کا علاج۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم اس مرض کا علاج کیا بتاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر مرض کو اس کے ابتدائی منازل میں پکڑ لیا جائے تو علاج آسان ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ

اگر یہ لوگ اپنی روش سے توبہ کر کے صحیح راستہ اختیار کریں تو ان کے لئے بہتر ہے۔
فَاِنۡ یَّتُوۡبُوۡا یَكُ خَیۡرًا لَّهُمۡ (۹/۷۴) اس سلسلہ میں قرآن انہیں ایک بات سمجھاتا
ہے۔ اور وہ بات بڑی اہم ہے' وہ ان سے کہتا ہے کہ تم عزت کے بھوکے ہو۔ تم یہ
تمام حرکات اس لئے کر رہے ہو کہ تم سے عزت کا مقام چھن گیا ہے۔ یہی تمہارا مرض
ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تمہیں پھر سے عزت کا مقام حاصل ہو جائے۔ اس کے لئے
تم اپنے ذہن سے یہ نسخہ تجویز کرتے ہو کہ اس جماعت کی تخریب سے تمہیں عزت اور
نمود حاصل ہو جائے گی۔ لیکن یہ غلط ہے۔ تم نے در حقیقت اپنے متعلق صحیح اندازہ نہیں
لگایا۔ تم نے سمجھا کہ اس تحریک کو تمہاری وجہ سے عزت حاصل ہے۔ اور جب تم اس
سے الگ ہو کر اس کی تخریب کرو گے تو اس کی عزت چھن جائے گی اور تمہیں عزت
مل جائے گی۔ یہ ہے تمہارا اپنے متعلق وہ غلط اندازہ جس کی وجہ سے تم جہنم کے عذاب
میں مبتلا ہو۔ یاد رکھو۔ وَ لِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَ لِرَسُوۡلِهٖ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ لٰكِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ
لَا یَعۡلَمُوۡنَ (۶۳/۸)۔ عزت تو اس تحریک کے ساتھ وابستگی اور اس جماعت کی رفاقت
ہی سے حاصل ہو سکے گی۔ جب تک تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ لیتے تمہارے دل کا
روگ دور ہو نہیں سکتا۔ تمہارا یہی روگ تھا جس کی وجہ سے تمہارے دل میں یہ خیال
پیدا ہو گیا کہ تم نے اس تحریک کا ساتھ دیکر اس پر بہت بڑا احسان کیا ہے ——
یَمُنُّوۡنَ عَلَیۡكَ اَنۡ اَسۡلَمُوۡا (اے رسول! یہ تم پر احسان دھرتے ہیں کہ اسلام لاکر
تمہارے ساتھ شامل ہو گئے)۔ اگر تمہارے دل میں طمانیت ہوتی تو تم یہ سمجھتے کہ اس تحریک
نے تم پر احسان کیا ہے جو تمہیں زندگی کا صحیح راستہ مل گیا۔ قُلۡ لَّا تَمُنُّوۡا عَلَیَّ اِسۡلَامَكُمۡ
بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیۡكُمۡ اَنۡ هَدٰىكُمۡ لِلۡاِیۡمَانِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (۴۹/۱۷)۔ (ان
سے کہدو کہ تم اپنے اسلام سے مجھ پر احسان مت جتلاؤ۔ تمہارا اسلام پر احسان
نہیں۔ بلکہ تم پر خدا کا احسان ہے کہ اس نے ایمان کی شمع نورانی سے تمہاری زندگی کی
راہیں روشن کر دیں۔ اگر تمہارے دل میں صداقت ہوتی تو تم احسان جتلانے کے بجائے
اپنے آپ کو زیر بار احسان محسوس کرتے اور اس صورت میں تمہارے دل کی کیفیت شکر
گذاری کی ہوتی نہ کہ شکوہ طرازی کی —— وہ ان لوگوں کو یہ کچھ سمجھاتا ہے تاکہ وہ دنیا اور

اس تحریک کا صحیح مقام سمجھ لیں۔ لیکن جن لوگوں کا مرض، علاج کی حد سے آگے بڑھ چکا ہو، وہ ان سے کہتا ہے کہ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ (۳/۱۱۸) یاد رکھو! اگر تم انہی خیالات میں غرق رہے تو تم اپنے غصے کی آگ میں بھسم ہو کر خود ہی مر جاؤ گے۔ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ یہ ہے وہ عبرت انگیز انجام جو ایسی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کا ہوتا ہے۔ ایسا عبرت انگیز کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ۔ (۴۴/۲۹)۔ پھر ان پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین کی آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ گروہ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کے لئے صحیح تدبیر یہ ہے کہ جو شخص آپ کی تحریک کا رکن بننا چاہے اس کے متعلق حتی الامکان تحقیق کر لی جائے کہ وہ

احتیاطی تدابیر

کس ذہنیت کا انسان ہے۔ یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ آپ ہر اُس شخص کو جو آپ کے فارم ممبری پر دستخط کر دے، ممبر بنا لیں اور بعد میں اُسے رکنیت سے خارج کرنا پڑے۔ خارج ہونے والا کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کریگا کہ اس کا اخراج اس کی کسی غلطی، کمی یا لغزش کی وجہ سے عمل میں آیا ہے (الا ماشاء اللہ) وہ سارا الزام تحریک اور اس کے اربابِ بست و کشاد کے سر دھرے گا اور اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لئے جگہ جگہ پراپیگنڈہ کرتا پھرے گا۔ پھر لوگوں کی ذہنیت بھی عجیب ہے۔ زندگی میں آپ کے بیسیوں دوست بنتے ہیں اور ان میں سے کتنے ایسے ہوتے ہیں جن سے کچھ وقت کے تجربہ کے بعد آپ کے تعلقات باقی نہیں رہتے۔ انہیں اپنے دوستوں کے حلقہ سے خارج کرنے میں آپ اپنے آپ کو کبھی موردِ الزام قرار نہیں دیتے۔ لیکن اگر کوئی تحریک، انہی حالات میں کسی کو اپنے حلقہ سے خارج کر دیتی ہے تو آپ اُس شخص کو نہیں، بلکہ تحریک کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ اگر آپ شروع ہی میں اس کا محاسبہ کر لیں اور اسے اپنی جماعت کا رفیق بننے کا اہل نہ سمجھیں تو اس کے لئے آپ کے خلاف کسی پراپیگنڈہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اصلاح کر کے آپ کے ساتھ شامل ہونے کے قابل بن جائے۔ یاد رکھئے! آپ کی تحریک، سیاسی جماعتوں جیسی نہیں، جن میں ساری نظر ارکان کی تعداد پر ہوتی ہے۔ آپ تعداد کی کثرت

پر بالکل نہ جاہیئے۔ دس مخلص قرآنی دوست، سو متفقین اور ہزار مذبذبین سے بہتر ہیں۔ اور اخلاص کا معیار ایک ہی ہے۔ یعنی اہلیت جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کے سامنے صرف ایک مقصد ہو۔ اور وہ یہ کہ قرآنی فکر سے وابستگی کے بعد میرے اپنے اندر کسقدر تبدیلی پیدا ہوگی اور میری اس رفاقت سے اس آواز کے آگے بڑھنے میں کسی حد تک مدد ملیگی۔ قرآنی تحریک میں تو شامل ہونے کا اہل ہی وہ ہے جس کا یہ ایمان ہوکہ۔

عشق میں ایک تم ہمارے ہو۔ باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

غریب لوگ

قرآنی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی سامنے آتی ہے، اور وہ یہ کہ اس دعوت پر سب سے پہلے غریبوں کی جماعت لبیک کہتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم، اس دعوت کی سب سے پہلی آواز کو سامنے لاتے ہی اس حقیقت کو نمایاں طور پر سامنے لایا ہے۔ جب حضرت نوحؑ نے قوم کے دولتمند طبقہ کے سامنے دعوت کو پیش کیا تو انہوں نے اعتراض ہی یہ کیا کہ ہم تمہاری جماعت میں کس طرح شامل ہو جائیں جبکہ حالت یہ ہے کہ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا۔ اس جماعت میں جو لوگ شامل ہوئے ہیں وہ ہمارے معاشرہ کے نہایت اونٰے درجے کے کمین لوگ ہیں۔ بَادِيَ الرَّاْيِ۔ ان کی شکل و صورت سے ظاہر ہے کہ وہ کس حیثیت کے مالک اور کس عقل و فکر کے حامل ہیں۔ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ (۱۱/۲۷)۔ کچھ اونچے طبقہ کے لوگوں کی جماعت ہوتی تو ہم اس میں شامل بھی ہو جاتے۔ آپ ان لوگوں کو جماعت سے نکال دیجئے۔ پھر ہم آپ کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ ان لوگوں سے آپ کو ملے گا کیا! ان کے اس مطالبہ اور اعتراض کے جواب میں حضرت نوحؑ نے جو کچھ کہا وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا۔ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ نہ ہی مجھے ایسا کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے تو اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ قلب سلیم لے کر حاضر ہوئے ہیں اور میزانِ خداوندی میں وزن، مال و دولت کا نہیں، قلب و نگاہ

کا ہوتا ہے۔ تمہاری نگاہ اپنی دولت اور وجاہت پر ہے۔ اور خدا کی نگاہ ان کے خلوص اور حسنِ نیت پر۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ۔ (۱۱/۳۱) لہٰذا وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ میں تمہاری خاطر ان مفلسوں اور غریبوں کو دھتکار نہیں سکتا۔ میں اگر تمہارے پاسِ خاطر سے، انہیں نکال دوں تو اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ (۱۱/۲۹) یہ جب خدا کے حضور اس کی شکایت کریں گے تو میں اس کا کیا جواب دونگا۔ اس لئے تمہارا مال و دولت تمہیں مبارک۔۔ میرے لئے یہی مفلس و نادار دنیا کی سب سے بڑی متاع ہیں۔

اور یہی وہ شکایت تھی جو سردارانِ قریش کو نبی اکرمؐ کے خلاف تھی اور جسے (علامہ اقبال مرحوم کے الفاظ میں) ابوجہل نے غلافِ کعبہ کو تھام کر اپنے خداؤں کے حضور با صد آہ و فغاں، ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ۔

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب ۔ از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست ۔ با غلامِ خویش بریک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ ۔ با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند ۔ آبروئے دودمانے ریختند

یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے، آسمانی انقلاب کے ہر داعی کی توجہ سورۂ عبس کے تمثیلی انداز میں منعطف کرائی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

عبس و تولیٰ

داعی الی القرآن کی کیفیت یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى اُسکے پاس ایک غریب اندھا آیا تو اس نے تیوری چڑھالی اور منہ پھیر لیا۔ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى۔ اس سے کوئی پوچھے کہ تجھے کیا معلوم کہ قرآن کی تعلیم اس کی کسقدر نشوونما کر دیتی۔ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى۔ یا وہ اسے سُن لیتا تو یہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ فائدہ کا موجب ہوجاتی۔ لیکن تو ایسے لوگوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کو زیادہ مستحق توجہ سمجھتا ہے مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى۔ جو اپنے آپ کو تجھ سے، تیری دعوت سے، اس قرآن کی فکر سے، مستغنی سمجھتے ہیں۔ تو چاہتا ہے کہ ایسے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر مومن بنائے حالانکہ تجھ

پر اس کا کچھ الزام نہیں آئیگا کہ ایسے لوگ حق و صداقت کی راہ پر کیوں نہیں آئے۔ تو اِن لوگوں کے تو پیچھے بھاگتا ہے۔ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى۔ اور جو خود دوڑتا ہوا تیری طرف آتا ہے۔ اور زندگی کی خطرناک گھاٹیوں کا خیال دل میں لئے ہوئے آتا ہے۔ تو اُس سے لاپرواہی برتتا ہے۔ حالانکہ یہی وہ لوگ ہیں جو فی الحقیقت تیری توجہ کے مستحق ہیں۔ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ۔ یہ تمثیلی بیان ایک بہت بڑی حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے۔ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ (۸۰/۱۱-۱۲)۔ سو جس کا جی چاہے اس فراموش کردہ حقیقت کو اپنے سامنے لے آئے۔ یہ ہے وہ عظیم نکتہ جس کی یاد دہانی' قرآن' ان لوگوں کو کراتا ہے جو اسس دعوت کو لے کر اٹھیں۔ لہذا برادرانِ عزیز! آپ کی حقیقی متاع یہی غریب و نادار سے رفیق ہیں جن میں اکثر کے پاس' اس سردی میں جسم ڈھانپنے کے لئے گرم کپڑے بھی نہیں۔ لیکن جن کے سینے میں ایسا گرم دل ہے جس کی حرارت' موم کے بنے ہوئے بڑے بڑے مہیب "خداؤں" کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے۔ اور وہ بھی ہیں جن کے پاس آپ کی اس محفل تک پہنچنے کے لئے ریل کا کرایہ تک بھی نہیں ہوتا لیکن وہ یہ کہتے ہوئے، مستانہ وار یہاں پہنچ جاتے ہیں کہ

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از وفورِ عشق — سودا ست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

لہذا میرے عزیز بھائیو! لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ (۱۵/۸۸) تم ان مفاد پرستوں کے مال و دولت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور اپنی توجہ اپنے ان نادار لیکن مخلص رفیقوں پر مرکوز کرو جو آپ کی حقیقی متاع ہیں۔

بہ چشمِ کم منگر عاشقانِ صادق را — کہ ایں شکستہ بہایاں' متاعِ قافلہ اند

میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ کی تحریک کو آگے بڑھنے کے روپے پیسے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی میرا مطلب یہ ہے کہ مال و دولت والوں میں مخلص اور وفا شعار ہوتے ہی نہیں۔ انہی میں عثمانؓ غنی جیسے بھی تو ہوتے ہیں — میرا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دل کی صداقت اور خلوص کی بنا پر نہیں بلکہ محض مالی امداد کے سہارے تحریک میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لئے شامل ہوں' وہ تحریک کے لئے ہمیشہ نقصان کا موجب ہونگے

آپ کی تحریک میں معیارِ فضیلت "تقویٰ" ہونا چاہیئے — یعنی خلوصِ قلب کے ساتھ فرائضِ منصبی کی ادائیگی — نہ کہ مال و دولت اور جاہ حشمت۔ آپ یہ نہ دیکھیئے کہ کسی کے پاس کیا ہے۔ یہ دیکھیئے کہ وہ خود کیا ہے! لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۶/۱۳۳)

آپ کا بنیادی معیار ہونا چاہیئے۔ آپ کی تو تحریک کا مقصد ہی یہ ہے کہ قرآنی تعلیم کی رو سے آپ کے اپنے اندر تبدیلی کسقدر پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے

اپنے اندر تبدیلی

آپ کے ہاں عزت اور فضیلت ماپنے کا معیار ہی "تبدیلی" ہونا چاہیئے نہ کہ خارجی مقبوضات۔ میں نے اس مرتبہ کھلے اجلاس میں اپنے ایک خطاب کا موضوع یہ رکھا ہے کہ "مومن کسے کہتے ہیں"۔ آپ اُسے بغور دیکھئے اور پھر اس کی روشنی میں اپنا محاسبہ کرتے رہیئے کہ آپ کے اندر کسقدر تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ اگر آپ کے اندر قرآنی زاویہ نگاہ سے تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر میرے عزیز دوستو! نہ آپ کو قرآنی فکر کا سمجھنا کچھ فائدہ دے سکتا ہے اور نہ اس تحریک کے ساتھ وابستگی کچھ مفید ہو سکتی ہے — اور جب میں "آپ" کہتا ہوں تو اس کے اندر اپنے آپ کو سب سے پہلے شامل کرتا ہوں۔ اس داخلی تبدیلی کے بغیر یہ آپ کے اجتماعات و تقاریب۔ آپ کے درس اور تقاریر، کھیل تماشہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن کے الفاظ میں۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ (۹/۶۵)

جن لوگوں کے متعلق آپ کو شکایت ہوتی ہے کہ وہ تحریک کے اندر ہوتے ہوئے بھی تحریک کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ الٹا تخریب کا موجب بنتے رہتے ہیں' یہ وہی ہیں جو اس تمام جد و جہد کو محض کھیل تماشہ سمجھتے ہیں۔ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴)۔ قرآن ان کے حلق سے نیچے اترا ہی نہیں ہوتا۔ اگر قرآن دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو یہ ناممکن ہے کہ اُس شخص کے دماغ میں کوئی خیال بھی ایسا آنے پائے جو قرآنی تحریک کے لئے نقصان کا موجب ہو۔ اس لئے برادرانِ گرامی قدر! آپ تھوڑی دیر کے لئے رُکئے اور اپنے اپنے دل کو ٹٹولئے کہ قرآن آپ کے دل میں اتر چکا ہے یا نہیں۔ قرآن دل میں اتر جائے تو پھر یہ ساری کائنات بدل جاتی ہے۔ پھر تو کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دَور — نکلے جو میکدہ سے تو دُنیا بدل گئی

رفیقانِ محترم! یوں تو اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں کونسا زمانہ ایسا تھا جس میں

قرآنی دعوت کی اہمیت

قرآنی دعوت کو عام کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ضرورت جس قدر شدید ہمارے دور میں آکر ہوتی ہے، ایسی شدت اس نے اس سے پہلے شاید ہی کبھی اختیار کی ہو۔ آج ایک طرف تو یہ کیفیت ہے کہ ساری دنیا سمٹ کر گویا ایک بستی بن گئی ہے اور دوسری طرف زمانہ وہ آگیا ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا (۷۶/۷) جس میں فساد کی چنگاریاں چاروں طرف پھیل رہی اور اڑ اڑ کر دوسروں کو لگ رہی ہونگی۔ اس حشر آسا افرا تفری اور قیامت نما نفسا نفسی میں ظاہر ہے کہ زندگی کے بلند مقاصد کی طرف توجہ دینے کی فرصت کسے ہوگی۔ ایسے عالم میں جبکہ

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے — گلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے

لیکن عزیزانِ من! یہی تو وہ وقت ہے جب قرآن کی آواز بلند کرنے والوں کی ہمتوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں قرآنِ خالص کی آواز صرف آپ کی اس ننھی سی جماعت کی طرف سے بلند ہو رہی ہے۔ اس لئے آپ کی ذمہ داریاں بھی عظیم اور آپ کی کوششوں کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ دنیا اپنے مختلف تجارب کو آزما چکی ہے۔ اسے نجات و سعادت کی راہ کہیں نظر نہیں آئی۔ انسانوں کے خود ساختہ نظریاتِ زندگی اور نظامہائے حیات میں یہ راہ نظر آہی نہیں سکتی۔ یہ صرف قرآن کی شمعِ نورانی ہے جو شبِ تیرہ و تار میں، راہ گم کردہ مسافروں کو سراغِ منزل دے سکتی ہے۔ سوچئے کہ اگر قرآن کی موجودگی میں انسانیت اس طرح سرگرداں و حیراں پھرے تو اس کی ذمہ داری کس کے سر عائد ہوگی؟ وقت ہے کہ آپ اٹھئے اور قرآن کے بابِ عالی پر دستک دے کر پکار دیجئے کہ

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلفِ عنبریں ساقی — ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

آپ دستک دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ نورانیت کا پیکر ساقیِ ازل کس طرح کوثر بدوش و جنت بداماں وجہِ شادابیٔ عالم بنتا ہے۔ آپ نے ایک "تجارت" تو ابوالمہوسون کی دیکھی ہے جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے اور جس کے متعلق، قرآن نے کہا ہے کہ ان کی تجارت انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکی۔ اور ایک تجارت وہ ہے جس کے متعلق آپکا خدا یہ کہتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۔ اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کی نشاندہی کروں

جو تمہیں درد انگیز عذاب سے بچالے! تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۶۱/۱۱) تم خدا اور اس کے رسول پر اس طرح ایمان لاؤ کہ وہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اور پھر خدا کے راستے میں اپنی جان و مال سے مسلسل جد و جہد کرتے رہو۔ اگر تم حقیقت کا علم رکھتے ہو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ سودا تمہارے لئے بہت نفع بخش ثابت ہوگا۔ یہی وہ تجارت ہے جس کے متعلق کیا گیا ہے کہ لَنْ تَبُوْرَ (۳۵/۲۹) اس میں کبھی نقصان نہیں ہوگا یہ سودا گھاٹے کا ہے ہی نہیں۔ اس سے تم کبھی تباہ نہیں ہوگے۔ لہذا برادرانِ عزیز! آپ کو اس تجارت میں اپنا "سرمایہ" لگانا چاہیئے۔ اس کا منافع روپے پیسے یا جھوٹی عزت اور تسکینِ پندار کی شکل میں نہیں ملتا۔ یہ ملتا ہے انسانی ذات کی نشو و نما کی شکل میں۔ اور جسے یہ منافع مل جائے اس کی تجارت کے نفع بخش ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے! دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ احباب کی ہمتوں میں برکت۔ ارادوں میں استقامت۔ عزائم میں رسوخ اور قدموں میں ثبات عطا فرمائے۔ اور آپ کو مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ۔ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۔ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ سے ہر مقام پہ محفوظ رکھے۔

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، یوں تو میری زندگی کی ہر سانس پہلے بھی اس مقصد کے لئے وقف تھی لیکن جب سے مجھے (سابقہ اپریشن کے بعد) گویا زندگی کی توسیع (EXTENSION) ملی ہے، یہ احساس اور بھی شدید ہو گیا ہے کہ مشیت نے ہنوز مجھ سے کچھ اور کام لینا ہے۔ لیکن یہ کام، میرے عزیز ہم سفرو! آپ کی رفاقت کے بغیر تکمیل تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے آپ اپنی رفتار کو اور ذرا تیز کر دیجئے۔ تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست۔ میری دعا تو قرآن کی بارگاہ میں ایک ہی ہے۔ کہ

روزم تو بر فروز و شبم را تو نور دہ — سایہ مہ و آفتاب نیست

آخر میں برادرانِ عزیز! میں بخلوص قلب آپ کا سپاس گزار ہوں کہ آپ نے اس سردی کے موسم میں اتنے دور دراز مقامات سے زحمتِ سفر گوارا فرما کر اپنے اس ملی اجتماع میں شرکت فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے اس جذبۂ کیف کو دیکھ کر خود میری زندگی بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ احباب کو خوش و خرم رکھے اور زندگی کے ہر بلند مقصد میں جو قرآن کے مطابق ہو، شاد کام و کامران فرمائے۔

والسلام علیکم۔ برادرانِ عزیز۔

نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کے

دِل کی دھڑکنیں

بزمِ مذاکرہ

۱۴ر نومبر ————•

بروز ہفتہ ————•

بوقت ۲ بجے ————•

عنوان

حق کی آواز کبھی صدا بصحرا ثابت نہیں ہوتی۔

NO TRUE VOICE IS EVER LOST

مسئلہ زیر نظر: طلوع اسلام کے انقلاب آفریں قرآنی پیغام کے راستے میں کون کون سے موانعات ہیں۔

صدرِ بزم: محترمہ ثریا عندلیب

میرِ کارواں: محترمہ مس شمیم انور

شرکائے مذاکرہ

(۱) خالد سلام۔ پروفیسر انجنیئرنگ کالج - لاہور
"تحریکِ طلوعِ اسلام اور اس کا مستقبل"

(۲) منیر غضنفر۔ (متعلم پنجاب یونیورسٹی شعبۂ طبقات الارض)
"عقل اور جذبات کی کشمکش"

(۳) مس زاہدہ منظور۔ (لیکچرار۔ گورنمنٹ کالج فار وومن - لاہور)
"ناسازگاریٔ ماحول" (انگریزی)

(۴) جاوید رحیم۔ (متعلم انجنیئرنگ کالج - لاہور)
"ذمہ داریوں سے فرار"

(۵) ڈاکٹر مس رشیدہ "معاشی موانعات"

(۶) مس شمیم انور (لیکچرار۔ کنیئرڈ کالج - لاہور)
"احتسابِ خویش کی کمی" (انگریزی میں)

حاصلِ مذاکرہ

حق کی آواز کے راستے میں تین سنگ گراں :-

(۱) مستبد حکمرانوں کا نمایندہ -

فرعون ــــ قانون کے نقاب میں ہوسِ اقتدار۔

(۲) باطل مذہبی پیشوائیت کا ترجمان -

ہامان ــــ خدا کے نقاب میں شیطان۔

(۳) سرمایہ پرستی کا پیکر۔

قارون ــــ ملکی ترقی کے نقاب میں ہوسِ زر پرستی۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی۔ وہی مرحبی وہی عنتری

اور ــــ علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

محترم خالد سلام

تحریک طلوع اسلام اور اس کا مستقبل

محترم صدر۔ خواتین و حضرات! قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کچھ مستقل اقدار ہیں جن میں کسی زمانے اور کسی حالت میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور انسان کے لئے ضروری ہے کہ کسی صورت میں بھی انکا ساتھ نہ چھوڑے۔

لیکن یہ چیز صرف انفرادی طور پر کر لینے سے کام نہیں بن سکتا کیونکہ ان مستقل اقدار پر مبنی ایک معاشرہ کا قیام، بجائے خویش ایک مستقل قدر ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان افراد کی رفاقت تلاش کی جائے جو ان مستقل اقدار پہ ایمان رکھتے ہوں۔ ان رفقاء کے ساتھ ہونے سے افراد کی قوت بہت بڑھ جاتی ہے اور اس سے صحیح معاشرہ کے قیام کے امکانات واضح تر اور نزدیک تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

تحریک طلوع اسلام اسی قسم کی ایک منظم کوشش ہے جو قرآن کی روشنی میں علم و عقل کی رو سے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر قرآن کی بتائی ہوئی مستقل اقدار پر مبنی ایک اسلامی نظام کے قیام کی داعی ہے۔

تحریک طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ کسی مذہبی فرقہ سے۔ نہ عملی سیاست میں حصہ لینا اس کے پروگرام میں ہے۔

اس کے نزدیک پاکستان کا استحکام نہایت ضروری ہے اس لئے کہ یہ خطۂ زمین ایک بلند نصب العین کے حصول کا ذریعہ ہے یعنی ملت کی وحدت اور قرآن کریم کی بنیاد پر صحیح اسلامی نظام کا قیام۔

اس نظام کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا اور اس میں وہ ہر نوع غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔

تحریک طلوع اسلام کا مسلک ہنگامے برپا کرنا نہیں بلکہ دلائل و شواہد اور علم و بصیرت کی رو سے قرآن کریم کی تعلیم کو اس طرح پیش کرنا ہے جس سے قلب و دماغ میں صحیح تبدیلی پیدا ہو جائے۔ کیونکہ اس قسم کی تبدیلی کے بغیر سیرت و کردار میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

اس تحریک نے اسلامی نظام کے خط و خال کو ابھار کر پیش کیا ہے بڑے واضح اور دلکش انداز میں جس میں قرآنی نظام معیشت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

"تحریک طلوع اسلام قرآنی نظام ربوبیت کی پیامبر ہے۔" قرآنی نظام ربوبیت کیا ہے؟ پاکستان میں قرآن کی روشنی میں ایک ایسے نظام کا قیام جس میں کوئی بھوکا نہ رہے اور ہر نوع غلامی سے آزاد ہو۔ لیکن نظام ربوبیت صرف جسم تک محدود نہیں۔ انسان میں جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے اس کی ذات یا انا۔ نفس یا خودی یا (PERSONALITY) کہتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا مقصد اس ذات یا نفس یا خودی کی نشوونما ہے۔ جس سے ایک فرد اس دنیا میں بھی سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کرتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی ارتقائے ذات کے مزید مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ ایک معاشرہ قائم کیا جائے جو تمام نوع انسانی کو بھوک۔ خوف اور ظلم سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دے سکے۔ قرآن اور اس کی روشنی میں استفادہ کرنے والی تحریک طلوع اسلام ایک ایسے معاشرہ کا قیام چاہتے ہیں جو افراد کو بنیادی ضروریات زندگی یا روٹی کی فکر سے آزاد کر دے تاکہ ان کی توانائیاں اور صلاحیتیں۔ حیوانی سطح زندگی سے بلند ہو کر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے فارغ ہو جائیں۔ جسے انسانی ذات کی نشوونما سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس تحریک کو گوناگوں مشکلات اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور تدبر فی القرآن کی اس دعوت کی بڑی شدید مخالفت ہوتی ہے اور پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ جو مفہوم قرآن کا طلوع اسلام پیش کرتا ہے وہ اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن بات یہ نہیں کہ وہ اسلام کے خلاف ہے بلکہ وہ ان مروجہ نظریات کے ضرور خلاف ہے جنہیں اسلامی کہہ کر پیش کیا جاتا رہا ہے اور جن کا اصل اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔

دنیا میں اب تک زمانہ سحر (MAGIC AGE) کا اثر باقی ہے۔ جس کی وجہ سے سمجھا جاتا ہے کہ الفاظ کے مفہوم کے علاوہ ان کا ایک جادوئی اثر بھی ہوتا ہے اور تعویذ۔ گنڈے جیسی توہم پرستیاں اس خیال کا ایک مظہر ہیں۔ لیکن یہ چیز زیادہ دور رس ثابت ہوئی ہے اور قرآن کے الفاظ کے متعلق بھی کچھ ایسا ہی تصور عام ہے۔ قرآن دنیا کی تمام کتابوں سے زیادہ پڑھا جاتا ہے اور اس کی تلاوت کی انتہا یہ کہ ایک شخص ایک دن میں پورا پورا قرآن تلاوت کر ڈالتا ہے۔ لیکن اسے جتنا کم سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور جتنی لاپرواہی اس کے مطالب سے برتی جاتی ہے اتنی دنیا کی کسی اور کتاب سے نہیں برتی جاتی۔ اور سوچئے کہ اگر کسی کتاب کی بھی مسلسل تلاوت کی جاتی رہے اور اس سے مقصد صرف یہ ہو کہ ثواب اور اجر اکٹھا ہو رہا ہے جن کے بوجھ سے جنت کے پلڑے کو اپنی طرف جھکایا جا سکے گا۔ تو اس کے مصنف کے متعلق کس قسم کا تصور قائم ہو گا؟ اور اگر مصنف کا رد عمل سمجھنا ہو تو یہ سوچئے کہ کسی بھی مصنف سے خواہ وہ آئن سٹائن ہو یا اقبال یہ کہا جائے کہ میں مسلسل آپ کی تصنیفات کو پڑھتا رہا ہوں لیکن سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا تو وہ اپنا سر پیٹ کر رہ جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کے الفاظ تو وہی ہیں جو وقت نزول تھے کیونکہ ان کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہوا ہے۔ لیکن ان کی روح بالکل نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ اور جب روح سامنے نہ ہو تو ان الفاظ کے ساتھ جو تصور وابستہ تھے آہستہ آہستہ ان کا مفہوم بھی بدل گیا۔ اور ایسے سانچوں میں ڈھل گیا ہے جو مسلمانوں کی تاریخ کے دور ملوکیت کی یادگار ہیں۔ لیکن اس دور انحطاط و زوال میں جو زیادتی امت مسلمہ پر وارد کی گئی وہ یہ تھی کہ جو مفہوم اور رواج تاریخ کے اس دور میں رواج پذیر تھے انہیں دوام عطا کر دیا گیا اور عقل و فکر و تدبر فی القرآن کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ کہ قرآن سے جو کچھ سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا اب اس میں مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں جس کا نتیجہ سوائے ذہنی تعطل وجمود کے اور کیا ہو سکتا تھا یوں ملت اسلامیہ کے قوائے عمل و فکر نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن بالفاظہ قرآن ہے۔ وہ عربی زبان کی مُنَزَّل مِن اللہ کتاب ہے یعنی اس کے الفاظ منزل من اللہ ہیں جن کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ اس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پر پہاڑ سے بھی زیادہ اٹل اور محکم ہے۔

جس طرح شعر کے ترجمے میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو اصل شعر میں ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن کا کوئی ترجمہ ایسا نہیں ہو سکتا جس میں اصل الفاظ کا بدل ترجمے کے الفاظ بن جائیں۔ اس لئے دوسرے الفاظ میں چاہے وہ کسی زبان میں ہوں قرآن کا صرف مفہوم ہی سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ جو کہ اپنے زمانے کی علمی سطح پر اطمینان بخش کہلا سکتا ہے۔

تحریک طلوع اسلام نے قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کی اصطلاحات اپنی خاص تراکیب رکھتی ہیں جنہیں قرآن نے تصریف آیات (آیات پھیر پھیر کر لانے کے ذریعے مختلف مقامات پر واضح کیا ہے اس لئے انکا مفہوم قرآن ہی سے متعین کرنا چاہیئے۔ اور مزید غور و تدبر سے قرآن کے مفہوم اور زندگی کے عملی معاملات پر ان کے اطلاق میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

کوئی مفہوم بھی نہ کسی طرح اصل کا بدل ہو سکتا ہے نہ ہی اس کی حیثیت مستقل قرار پا سکتی ہے۔ زمانے کی علمی سطح بلند ہونے کے ساتھ ساتھ پچھلے تراجم اور مفہوم ناکافی ہو جاتے ہیں اگر کسی دور کے ترجمہ کو سند دوام عطا کر دی جائے تو اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پروفیسر ٹوئن بی اپنی کتاب :-

(A HISTORIANS APPROACH TO RELIGION)

میں لکھتا ہے ۔

> عیسائیت اور اسلام نے جب اپنی آسمانی کتابوں کا ترجمہ فلسفہ یونان کی اصطلاحات میں کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں بے جان و بے روح ہو کر رہ گئیں ..... یونان کا فلسفہ ایک وقتی اور مقامی حیثیت رکھتا تھا اس کے برعکس یہ آسمانی کتابیں اپنی اصلی شکل میں زمان کی قید سے ماورا تھیں (۱۲۶)

ان تصریحات کی روشنی میں نظر آئیگا کہ تحریک طلوع اسلام کی کوشش علم وعقل کی رو سے زمانے کی علمی اور تحقیقاتی سطح پر قرآن کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش ہے تاکہ قرآنی مستقل اقدار کی چٹان کے سہارے زمانے کے مدو جذر پر ڈولتی ہوئی انسانی کشتیٔ حیات کا لنگر باندھا جا سکے اور ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جا سکے جو بقول ڈاکٹر اقبال ثبات، و تغیر کا حسین امتزاج اپنے رکھتا ہو۔ یعنی قرآن کے مستقل اقدار اور ان کی روشنی میں عقل کی رو سے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا حل۔

طلوع اسلام کے پیش نظر ذہنی جمود و تعطل کی بھاری برفانی سلوں کو پگھلانا اور قرآنی الفاظ کے مفہوم کو واشگاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ مخالفت کے اس ہجوم کا بھی اسے مقابلہ کرنا ہے جو مختلف صورتوں میں راستے میں روک بن کر حائل ہیں تاکہ قرآنی نظام کے قیام کی راہ استوار ہو جائے۔

تحریک طلوع اسلام امت میں اتحاد کلی کی علمبردار ہے اور پوری نوع انسانی کو ایک عالمگیر برادری بنانے کی داعی۔ لیکن ارباب مذہب کی طرف سے اس دعوت اتحاد کی سخت مخالفت ہوتی ہے۔ اور تمام فرقے اس مخالفت میں مجتمع ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ کسی مذہبی فرقہ سے۔ اور نہ یہ کبھی کسی ایک فرقہ کی تنقیص کرتا ہے اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس کی یہ مخالفت کیوں ہو رہی ہے؟ اس لئے کہ یہ اتحاد امت کی دعوت دیتا ہے اور فرقہ پرستی کو از روئے نص قرآنی شرک قرار دیتا ہے لیکن فرقہ پرستی کی تہ میں جو اسلاف پرستی کا جذبہ موجزن ہوتا ہے ٹھیس دراصل اس کو لگتی ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ فرقے بنتے ہی اسلاف کی تقلید سے ہیں اور فرقوں میں قدر مشترک اسلاف کی تقلید ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ قرآن کی مخالفت میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ آپس میں ان کا حال یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے اپنے اپنے قانون شریعت ہیں اور ان میں سے کوئی فرقہ کسی دوسرے فرقہ کے قانون کو اسلام تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ سورہ بقرہ میں قرآن "ما انزل اللہ" یعنی قرآن کے اتباع کو اسلاف کے مسلک کے اتباع کے مقابلے میں لایا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۔ (۲/۱۷۰)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ما انزل اللہ کا اتباع کرو تو جواب دیتے ہیں ہم تو اس مسلک کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہمارے آبا و اجداد چلتے رہے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص یا تحریک انہیں قرآن کے اتباع کی طرف دعوت دیتی ہے تو یہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے

اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ تم اپنے اسلاف کے متعلق فیصلہ کرو کہ ان کی ہر بات غلط تھی۔ وہ کہتا صرف یہ ہے کہ ہر بات کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھو۔

ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ جو باتیں قرآن کے مطابق ہوں انہیں صحیح سمجھو۔ جو اس کے مطابق نہ ہوں انہیں غلط سمجھو۔ اس اس لئے کہ صحیح اور غلط کا معیار خدا کی کتاب ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

اور جو ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ یہی تو انکار کرنے والے ہیں۔

اور یہی وہ محکم قوت ہے جس سے اس تحریک پر لگائے ہوئے تمام الزامات کی دھجیاں بکھر جاتی ہیں۔ ایسے بے بنیاد الزامات کے سرفہرست منکر حدیث اور منکر رسالت جیسے جذباتی سلوگن ہیں جو مذہب پرست طبقہ عوام کے جذبات مشتعل کرنے کے لئے مشتہر کرتا رہتا ہے۔

یہ الزامات قطعاً غلط ہیں۔

قرآن نے نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کو تمام نوعِ انسانی کے لئے قیامت تک بلندیٔ اخلاق و کردار کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ اس اسوۂ حسنہ کے اتباع میں شرفِ انسانیت کا راز پنہاں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری کتب روایات میں ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت طیبہ پر طعن پڑتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی روایات وضعی ہیں
طلوع اسلام صرف اس قدر کہتا ہے کہ احادیث کے مجموعوں میں صحیح احادیث بھی ہیں اور غلط بھی۔ (اور اس بات کو تمام مسلمان مانتے ہیں۔ بلکہ فرقوں میں باہمی اختلاف کی ایک وجہ حدیثوں اور فقہ کے اپنے الگ الگ مجموعوں کا ہونا ہی ہے)۔ جو روایات قرآن کریم کے خلاف ہوں یا ان سے نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ پر کسی قسم کا حرف آتا ہو۔ وہ صحیح نہیں ہو سکتیں۔

پھر سن لیجئے کہ غلط اور صحیح کا معیار خدا کی کتاب ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وحدت امت کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب ہر طرف سے مایوس کن ملتا کہ صاحب ان فرقوں کو اب ختم کرنا اور امت کو ایک پلیٹ فارم پر لانا ممکنات میں سے نہیں ہے۔

لیکن اس عالم مایوسی کی گھٹا ٹوپ لاہوتیت میں تحریک طلوع اسلام نے قرآن کی قندیل ہدایت بلند کی ہے اور کیا ہے کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔

وحدت امت اور تمام مسلمانوں کے لئے واحد اور مشترک اسلامی قانون مدون کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ

" قرآن کریم کو قانون کی غیر متبدل بنیاد قرار دیدیا جائے "

رسول اللہ کے زمانے میں امت میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ اور مقام صد شکر ہے کہ مختلف فرقوں کا قرآن الگ الگ نہیں۔ لیکن فقہ اور روایات ہر ایک کی الگ الگ ہیں۔

قرآن کریم کو بنیاد قرار دے کر مختلف فرقوں کی فقہ اور روایات کو سامنے رکھا جائے اور ان کی روشنی میں علم و بصیرت کی مشاورت سے ایسا قانون مرتب کیا جائے جو ہمارے زمانے کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس کے سوا

وحدت امت کی کوئی صورت نہیں -

جب تک ایسا نہ ہو جائے - امت کے مختلف فرقے جس طرح ارکان اسلامی ادا کرتے چلے آرہے ہیں ان میں کسی قسم کا رد و بدل یا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنے کا حق کسی فرد یا گروہ کو نہیں - کیونکہ اس سے ایک اور فرقہ کی بنیاد پڑ سکتی ہے - یہ حق صرف خلافت علیٰ منہاج نبوت " کو ہی دیا جا سکتا ہے کہ وہ وحدت پیدا کرنے کے لئے قرآن کی روشنی میں کوئی ایک طریقہ مقرر کر دے جس سے امت کا موجودہ اختلاف و انتشار ختم ہو جائے

تحریک طلوع اسلام کی آواز بظاہر بڑی انوکھی اور کچھ نئی سی معلوم ہوتی ہے - لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں - اپنی اصل کے اعتبار سے بات وہی ہے جو آج سے تیرہ صدیاں پہلے ریگ زار حجاز سے اٹھی تھی اور جس نے اپنی انقلابی روح تمام دنیا میں پھونک دی تھی اور دنیا والوں کو نئے معیار زیست سکھلائے تھے -

قرآن کے پیغام کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ہر زمانے کو اپنے جلو میں لئے آگے بڑھتے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے - اس خصوصیت کی بنا پر وہ ایک ایسے ماحول میں جہاں اس کے الفاظ تو رٹے جاتے ہوں لیکن روح کی طرف کبھی دھیان بھی نہ جائے - نیا معلوم ہوتا ہے - دراصل یہ ہر انقلابی پیغام کی طرح زمانے سے آگے ہی ہوتا ہے اس فرق کے ساتھ کہ آنے والے تمام زمانوں کی امامت کرنے کی لامحدود صلاحیتیں اس میں پائی جاتی ہیں بشرطیکہ اسے خارجی اثرات سے خالی الذہن ہو کر سمجھنے کی کوشش کی جائے -

یہ آواز ہمیں نئی اس لئے معلوم ہوتی ہے کہ ہم نے اُن مستقل اقدار کو اپنی جہالت کے تو بر تو غلافوں کے پردے میں چھپا رکھا ہے - جس کا نتیجہ یہ ہے - کہ ہم عملی طور پر اس پیغام ازلی سے بیگانہ ہو چکے ہیں - اور جب تک اِن پردوں کو ایک ایک کرکے ہٹا نہ دیا جائے اس کے خوش آئند نتائج ظہور پذیر کیسے ہوں !

ہمارا قدامت پرست طبقہ اسلاف پرستی کے چکر میں اس طرح پھنسا ہوا ہے کہ وہ اس میں سے خود تو نکل نہیں سکتا لیکن ساتھ ہی اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان غلافوں کے نیچے دبے ہوئے اس انقلابی پیغامِ حیات کو کوئی اور دیکھنے نہ پائے اور اس کوشش میں اس طبقہ پر بڑی بڑی اضطرابی کیفیات گذرتی رہتی ہیں جن کا ظہور کفر کے فتووں سے ہوتا رہتا ہے -

دوسری طرف تعلیم یافتہ طبقہ اس مذہب اور فرقہ پرستی سے بیزار ہو چکا ہے - اور چونکہ کوئی مثبت نظام حیات ان کے سامنے ہے نہیں اس لئے جو فلسفہ بھی مغرب و شمال میں ترقی پذیر ہوتا نظر آتا ہے اسکو اپنانے پر آمادہ ہو جاتا ہے -

اس چل چلاؤ میں کمیونزم یا سوشلزم یا دہریت یا دوسرے مغربی فلسفہ ہائے حیات کے ان بڑھتے ہوئے سیلابوں کی طرف اندھا دھند جاتے ہوئے ان نوجوانوں کو کوئی چیز روک سکتی ہے تو وہ صرف قرآن کا پیغام ہے کہ جس کو مان لینے سے انسانیت تباہیوں سے محفوظ رہتی ہوئی آگے بڑھ سکتی ہے -

طلوع اسلام کی تحریک قرآن کی طرف دھڑلے سے آواز دے کر علیٰ وجہ البصیرت یہ کہہ رہی ہے کہ ذرا اپنے قدم

جاگ کر رکھو اور سوچو کر تم کہاں جا رہے ہو؛ تم چاہو تو ان سیلابوں کا رخ موڑ سکتے ہو، کائنات تو تمہارے لئے مسخر کی گئی ہے تم کیوں مجبور محض بنتے ہو)۔

اس آواز ہی کا اثر ہے کہ اس انبوہ کثیر کی افراتفری میں ایک ایک دو دو کر کے نوجوانوں نے سوچنا شروع کر دیا ہے۔

تحریک طلوع اسلام نے نوجوانوں کی پریشان نظری کا اور ہر الجھن کا بغائر مطالعہ کیا ہے اور انکا نہایت پرسکون اور تسلی بخش جواب قرآن کی روشنی میں انہیں دیا ہے۔ قرآن غور و فکر کرنے والوں کو کبھی لا حول ولا قوۃ اور کفر کے خطابات سے نہیں نوازتا اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

تحریک طلوع اسلام نے حق کی آواز کا ساتھ دیا ہے جو کبھی ضائع نہیں ہو سکتی۔ اور حق سے مراد خدا کے اٹل قوانین ہیں جو کہ کائنات میں از خود جاری و ساری ہیں لیکن انسانوں کی دنیا کے لئے بذریعہ وحی دیئے گئے مستقل اقدار کی صورت میں اب قرآن میں محفوظ ہیں۔ ان قوانین کا آخرالامر غالب آنا کائناتی پروگرام میں سے ہے اور اس پروگرام کو دنیا کی کوئی قوت شکست نہیں دے سکتی۔

اس تحریک کے متعلق پچھلے سال ایک ولندیزی مصنف کی شائع شدہ کتاب میں ذکر آیا تھا۔ یہ کتاب ہالینڈ میں شائع ہوئی تھی جس کا نام ہے (MODERN MUSLIM QURAN INTERPETATION) اور مصنف کا نام (J.M.S. BALJAON) ہے۔ اس نے تحریک کا ذکر کر کے پرویز صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ۔

> "پرویز صاحب کی خوبی یہی نہیں کہ اس نے قرآنی حقائق کی ایسی عمدہ تشریح کی ہے یا انہیں اس قدر بلند پایہ ادیبانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ وہ درحقیقت ایک عمدہ معلم ہے جسے فطرت نے اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ان نوجوانوں کے لئے جو مذہب سے برگشتہ ہو رہے ہیں اور ان کی زندگی کی کشتی کو ایک لنگر کی ضرورت ہے۔ ایک مشفق دوست ہے۔
>
> پرویز صاحب ایک مشفق معلم ہونے کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے تقاضوں پر بھی بڑی گہری نگاہ رکھتا ہے۔ اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا اس کا اثر بڑھتا جائے گا"

ابھی سے نظر آرہا ہے کہ اس تحریک کا (IMPRESS) تاریخ پر ہونے والا ہے۔ قرآن کی تعلیم کو دانشگاف

کردیا جائے اور اس پرعمل کا بیج بو دیا جائے تو علیٰ وجہ البصیرت ہمیں یقین ہے کہ اس میں وہ زورِ دروں ہے کہ یہ آگے بڑھتی جائے اور پوری انسانیت کو اپنی آغوشِ ربوبیت میں لے لے۔

آنے والا مورخ انسانیت یا کم از کم ملت اسلامیہ پاکستان کی نشاۃ ثانیہ اور تاریخ کے آئینہ دار روشن درخشندہ دور کو دیکھے گا تو وہ کبھی طلوع اسلام کی تحریک کو نظر انداز نہ کر سکے گا۔

آرزو ہے کہ صحنِ گلستانِ ملت کی بہار آفرینیوں کے طائرانِ پیش رس تو اسی تحریک کے وابستگانِ دامن ہیں۔ خدا ان کی قوتِ پرواز میں اور ترقی عطا فرمائے کہ ان کی منزل ثریا سے بھی بلند ہے — اور ایسا ہو کر رہے گا۔ کیونکہ حق کی آواز کبھی صدا بصحرا نہیں ہوتی۔ والسلام

---

(۲)

محترم منیر غضنفر

قرآن ذہن انسانی کو اپیل کرتا ہے نہ کہ جذبات کو

محترم صدر اور معزز سامعین۔

سب سے پہلے میں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اپنی اس تقریر میں۔ میں جہاں کہیں مذہب کا لفظ استعمال کروں گا اس سے میری مراد ہمارا خود ساختہ رسومات اور عقائد کا مجموعہ ہو گا جو ہمارے لئے چند مفاد پرستوں نے جمع کر رکھا ہے اور وہ اس دین سے بالکل مختلف ہے جو خدا تعالیٰ نے ہمارے لئے ضابطۂ حیات بنا کر بھیجا اور جس پر ہم علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں۔

محترم صدر۔

پاکستان بننے کے بعد صرف ایک چیز میں ترقی ہوئی ہے اور وہ ہے (VESTED INTERESTS)

یعنی چھپی اور کھلی مفاد پرستیاں۔ معاشی ترقی اور صنعتی ترقی وغیرہ سب اس چھپی اور کھلی مفاد پرستیوں کے حد سے بڑھنے کے نام ہیں۔

مفاد پرست کبھی کھلے بندوں سامنے نہیں آتے۔ وہ کاروبار، تجارت، قومی سرمایہ اور مذہب وغیرہ کے عام فہم اور بظاہر بے ضرر ناموں کو اپنی ڈھال بنا رکھتے ہیں۔ اور سر سے پاؤں تک خوش رنگ لبادے اوڑھے پھرتے ہیں۔ کوئی معاشی ترقی کے لبادے میں ملبوس ہے تو کوئی مذہب کے۔ کوئی اخبار کے صفحہ اول پر ڈاکٹر کا لبادہ اوڑھے ہمارے لئے ہاضمے کی بہترین گولیاں تیار کر کے لاتا نظر آتا ہے، تو کوئی مسلسل جان کنی اور قوم کے حق میں متحدہ قربانیاں دینے کے بعد بال سیاہ کرنے کا اکسیر نسخہ بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔ اُسے اپنا کوئی فائدہ مقصود نہیں۔ وہ تو قوم کے فائدے کے لئے مارا مارا پھرتا ہے۔ انہی لبادہ پوشوں میں قوم کے ایسے فرزند بھی نظر آتے ہیں جن کے دماغ میں ملک کو صنعتی یعنی (INDUSTRIAL) بنا دینے کی دھن سمائی ہے۔ وہ اپنے فائدے اور صحت و آرام اور چین کا خیال کئے بغیر فیکٹری پر فیکٹری بنائے چلے جاتے ہیں۔

ان مفاد پرستوں کے لئے سب سے اہم چیز بھولے بھالے لوگوں کی جذبات پرستی ہے۔ یہی وہ جذبات پرستی ہے جس کے لئے مفاد پرستوں کی اپیل مخصوص ہے۔ لیکن یاد رکھئے جذبات پرستی صرف اُسی صورت میں ممکن ہے جب ذہنی قوتوں کو پس پشت ڈال دیا جائے ـــــ وہ اس بات کو جانتے ہیں۔ اُن کے ترکش زہر آلود تیروں سے بھرپور ہیں۔ اور وہ ان ہتھیاروں سے واقعی قومی طور پر ہماری سوچنے کی طاقت، آزادیٔ خیال اور آزادیٔ رائے سلب کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

مذہب مفاد پرستوں کے ترکش میں سب سے بڑے تیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ نہیں نہیں۔ بلکہ یہ ایسی توپ ہے جو ہمیشہ میدان مار لیتی ہے۔ اور کارگر ثابت ہوتی ہے ـــــ لیکن یاد رکھئے آپ اس توپ کی زد میں صرف اُسی وقت آ سکتے ہیں جب دین نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ جب دین اور قرآن کی صحیح تعلیم سامنے ہو تو مذہب کے گولے چلتے ہی نہیں۔ مذہب کے توپچی اِسے جانتے ہیں۔ اور وہ ہمیں اس بات پر رضامند کر لیتے ہیں کہ ہم عقل و خرد کی وہ عینک اتار کر جس سے دین نظر آتا ہے وہ عینک پہن لیں جس سے جذبات کے کانٹے پھول نظر آئیں۔

خوف عقل و خرد کے خلاف مفاد پرستوں کا سب سے بڑا اور سب سے قیمتی ہتھیار ہے۔

مجھے یاد ہے اور آپ کو بھی یاد ہو گا کہ بچپن سے لے کر عمر کے آخری حصہ تک ہمیں اللہ سے صرف ڈرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خدا کے متعلق کچھ سمجھانے کی کوشش نہیں کی جاتی ـــــ یاد رکھئے کہ خواہ ڈر انسان کا ہو یا بھگوان کا۔ ڈر اور صرف ڈر سے کبھی صحیح تربیت ممکن نہیں۔ خوف انسانی (PERSONALITY) کے

بہترین حصہ پر حملہ آور ہوتا ہے ــــــ وہ انسانی ذہن سے سوچ اور آزادیٔ خیال کی طاقت "ضبط" کر لیتا ہے۔

ــــــ یاد رکھئے انسانی (PERSONALITY) میں عقل و خرد کو بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جذبات بھی اچھی (PERSONALITY) کا ایک ضروری حصہ ہیں لیکن جذبات کا مقام اور ہے۔ ارادہ کے بناتے وقت اور کسی نقطۂ نظر یا خیال کو پرکھتے وقت عقل کا مقام جذبات کو نہیں بخشا جا سکتا۔

ــــــ ہر شے کو اُس کا صحیح مقام دینا ہی تو عدل ہے۔

قرآن ہمیں ذہنی آزادی سے روشناس کراتا ہے۔ وہ صرف ہمارے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اور تو اور وہ خود اپنے پر بھی بغیر سوچے سمجھے ایمان لانے کی تلقین نہیں کرتا۔ اُسے ایک ہی گلہ ہے۔ کہ لوگ غور نہیں کرتے۔ وہ سوچتے نہیں۔ بغیر سوچے سمجھے سنی سنائی باتوں پر یقین کئے جاتے ہیں۔ آج مذہب کی دنیا میں خدا کا کام ہی وہ مانا جاتا ہے جو عقل و خرد سے بالاتر ہو۔

ہم خواہ سیاسی اور اقتصادی طور پر آزاد ہوں۔ جب تک ہمیں ذہنی آزادی میسر نہیں۔ یہ آزادی، آزادی نہیں۔ آزادی کے فریب میں چھپی ہوئی غلامی ہے۔

خواتین و حضرات! ستر برس میں مذہب کی اس ترقی اور جذباتیت کے اس چڑھاؤ نے بالآخر آزادیٔ خیال کا مکمل طور پر گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔ اب کوئی شخص مذہب سے کھلے بندوں کوئی سوال نہیں پوچھ سکتا۔ اب کسی میں یہ جرأت نہیں کہ اسلاف کے کسی کام یا کسی نام پر نقطہ چینی کر سکے۔ مذہب کے اجارہ دار اپنے دائرے اپنی (REALM) میں مکمل ڈکٹیٹر بن چکے ہیں لیکن یاد رکھئے۔ مت بھولئے۔ مذہب یا جذبات کچھ دیر کے لئے لوگوں کی زبان بندی تو کر سکتے ہیں لیکن لوگوں کے سینوں میں خفیہ طور پر اپنے خلاف نفرت کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کو بند نہیں مار سکتے۔ خواہ لوگ اس بات کو خود بھی تسلیم نہ کریں لیکن وہ عملاً سوچے بغیر (UN-CONSCIOUSLY) اس بات کا واضح ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ وہ جذباتیت کی اس حکومت کے خلاف کچھ کہہ تو نہیں سکتے لیکن وہ اسے پسند بھی نہیں کرتے۔ ایک دو نسلوں کے بعد یہ خود فریبی بھی ختم ہو جائیگی ــــــ یاد رکھئے کچھ زمانہ نہ گزرا مغرب بھی ہماری طرح مذہب پرست تھا۔ وہ لوگ بھی ہماری طرح اپنے خود ساختہ مذہب اور مذہبی اجارہ داروں سے خوف کھاتے تھے ــــــ آج وہاں مذہب کے نام لیوا چند قدامت پرست لوگ ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ کہیں ایسا حال ہمارے مذہب کا بھی نہ ہو۔ کیونکہ مذہب کوئی بھی ہو اس کا بہر حال یہی انجام ہونا ہے۔ باطل کو مٹنا چاہیئے، اور وہ مٹ کر رہے گا۔ ہاں! میری یہ خواہش ضرور ہے کہ باطل کی جگہ ایک اور باطل نہ لے بلکہ

حق کی فتح ہو اور ہم مذہب کو چھوڑ کر دین کو اپنا لیں ۔

سامعین ۔ اس بات کی کہ مذہب نے ہماری غور و فکر کی قوت کو کس طرح معطل کر کے رکھ دیا ہے اس سے بہتر کیا مثال ہوگی کہ قرآن کے الفاظ کو سوچے سمجھے بغیر دھرانا برکت اور کار ثواب سمجھا جاتا ہے ۔ مُلا کے تصور کا ثواب تو اس سے حاصل ہو جاتا ہو گا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس قسم کی تلاوتِ قرآن سے آپ کے خیالات نظریات میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے ؟ کیا ایسا ہونا کبھی ممکن ہے ۔ دینی ثواب ۔ روحانی ترقی اور شریعت ۔ یہ الفاظ لاشعوری طور پر ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں ۔ اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جہاں ان الفاظ کی عملی تکمیل ہو ۔ جو شخص اپنی تقریر و تحریر میں ان الفاظ پر زیادہ زور دیتا ہے ۔ وہ ہمیں اسلامی معاشرہ کے قیام کا بڑا داعی اور شائق نظر آتا ہے ۔ ——— لیکن کیا ان الفاظ کا ہم نے قریب سے بھی معائنہ کیا ہے ——— اُن الفاظ کا جن کے متعلق قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ

اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ ۔

کچھ الفاظ ہیں جنھیں تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے اختیار کر رکھا ہے ——— کیا تم نے کبھی ان مبہم الفاظ کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کی ہے ۔ کبھی ہم نے اُن کا تجزیہ و موازنہ کیا ہے ۔ نہیں کبھی نہیں ۔

——— صرف اس لئے ہی نہیں کہ ہمیں اپنے روزمرہ کے کاموں سے فرصت ہی کب ملتی ہے ۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ہم نے سوچنا ترک کر دیا ہے سوچ ہم نے صرف کاروبار کے لئے مخصوص کر رکھی ہے ۔ ——— لیکن یاد رکھئے کہ ہمارے کاروبار اور ہماری خوشی (HAPPINESS) کا بہت زیادہ انحصار اس پہ ہے کہ ہم کس قسم کے معاشرے میں رہتے ہیں ۔

محترم پرویز صاحب اس بات کی کئی دفعہ وضاحت کر چکے ہیں کہ ایک غلط معاشرے میں اخلاقی ترقی اور صحیح خوشی ممکن نہیں ۔ ... ——— اگر یہ درست ہے تو پھر آپ کیوں سوچ سے معذور ہو بیٹھے ہیں ۔ اور اگر ممکن نہیں تو پھر سوچیئے کہ اس سے بالآخر حاصل کیا ہو سکتا ہے !

ایک تاریخ دان نے خوب کہا ہے کہ تاریخ جنگوں ۔ واقعات اور حکومتوں کا نام نہیں ۔ تاریخ نظریات اور خیالات کا سفرنامہ ہے ——— نظریات غور و فکر اور سوچ بچار سے جنم لیتے ہیں ۔ اور اسی سے بدلتے ہیں ۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی انحطاط پذیر خراب حالت کو بدل ڈالیں ۔ یہ صرف مادی ترقی سے ممکن نہیں ۔ ہمیں کچھ نظریات چھوڑنے ہونگے اور کچھ اپنانے ہونگے ——— ہمیں جرات سے کام لینا ہوگا اور اجارہ داریاں ختم کرنی ہونگی ۔ خواہ وہ سیاسی ہوں ۔ اقتصادی ہوں یا مذہبی ہوں ——— اس میں شبہ نہیں کہ ایسا کرنے سے بہت سے چہروں پر سے مقدس نقاب اتر جائیں گے ۔ اور بہت سے رزق کے ایسے دروازے بند ہو جائیں گے جو محض

ان نقابوں کے صدقے کھلے ہیں۔ لیکن ایک صحیح معاشرہ کے قیام کے لئے نہ تو نقاب پوشوں کو نقاب میں رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے نہ اقتصادی اجارہ داروں کو دوسروں کی روزی پر قبضہ جمانے کی۔

خواتین وحضرات! شائد آپ نے کبھی سوچا ہو کہ قرآن جو شروع سے آخر تک مفاد پرستوں۔ مُترفین۔ سے لڑتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اپنی دعوت دلائل و براہان اور عقل پہ رکھتا ہے اور یہ عوام کے جذبات کو بڑھکاتے ہیں۔

ساری کشمکش ہی یہ ہے۔

حضرت شعیبؑ لوگوں سے کہتے ہیں۔ "کم مت تولو"۔

لوگ جواب دیتے ہیں کہ شعیبؑ! تیری بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی — واہ! کیا لاطینی بول دی جو سمجھ میں نہیں آتی — جی ہاں۔

ٹھیک ہی تو ہے جذبات پرستی کے سرسام میں عقل وخرد کی بات سمجھ میں کیسے آسکتی ہے۔

اب یہ سوال آپ کے ذہن میں پیدا ہوسکتا ہے کہ ملک میں ایک چھوٹا سا طبقہ ہی سہی۔ لیکن ملک میں سوچنے سمجھنے والا ایسا طبقہ ہوگا تو سہی۔ اُسے کیا ہوگیا؟ — لیکن شائد آپ نے کبھی یہ نہ سوچا ہو کہ ان حالات میں عقل وخرد کے دیئے جلانا کسی بڑے ہی دیوانے کا کام ہے۔ جذباتیت کے تندوتیز جھکڑوں میں اب کون عقل وخرد کا چراغ جلا کر بیٹھ جائے — لیکن یاد رکھئے ہماری ساری تاریخ تاریک وتار راتوں میں صرف انہیں ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی داستان ہے! جذبات کی تندوتیز آندھیاں جنہیں کبھی نہ بجھا سکیں۔

ع - ہوا ہے گو تندوتیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے -

یہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ -

لیکن مقامِ شکر ہے کہ ہمارے ملک میں وہ دیوانے بھی موجود ہیں۔ اور انہی کی موجودگی سے ہماری قوم کی بلکہ عالم انسانیت کی توقعات وابستہ ہیں۔ ان دیوانوں کی ہاؤ ہو کا مرکز یہی ادارہ طلوعِ اسلام ہے جہاں ہم اس وقت یہ سوچنے کے لئے بیٹھے ہیں کہ ملک کے مفاد پرست خرد مندوں کو قرآنی دیوانے کیسے بنایا جائے اس میں شبہ نہیں کہ دیوانوں کی اِس آواز کی سخت مخالفت ہورہی ہے۔ لیکن اس آواز کو جتنا دبایا جاتا ہے۔ اُتنی ہی یہ اور ابھرتی ہے اس لئے کہ یہ حق کی آواز ہے۔ قرآن کی آواز ہے۔ انسانیت کے دل کی آواز ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ اب اُن نوجوانوں کی آواز ہے جنہیں مذہب پرستوں نے خدا سے دور بھگا دیا تھا۔ لیکن اس آواز نے انہیں پھر اُس کے قریب کردیا ہے۔ اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب دیوانگی نوجوانوں میں پھیل جائے تو اُس کی قومیں بے پناہ ہوجاتی ہیں۔ اور جب یہ قوتیں قرآن کے کنٹرول کے اندر رہیں تو اُن کے تعمیری نتائج انسانیت کے ویرانوں کو

آبادیوں میں بدل دیتے ہیں۔ میں دل کے پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان نوجوانوں کے ہاتھ یہ ویرانے آباد ہو کر رہیں گے۔ اس لئے کہ

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

---

(۳)

محترمہ (مس) زاہدہ منظور
(انگریزی تقریر کا رواں ترجمہ)

فکر جدید کے لئے ملک کا ماحول سازگار نہیں

صدر محترمہ - خواتین و حضرات !

۱۹۴۸ء میں جب قائد اعظم حیدر آباد (دکن) گئے تو انہوں نے طالب علموں کے ایک گروہ کے سوال کے جواب میں بتایا کہ "اسلامی مملکت" سے ان کا مفہوم کیا ہے۔ انہوں نے کہا ۔

> اسلام میں اطاعت نہ کسی بادشاہ کی ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور فرد کی نہ کسی ادارہ کی۔ یہ صرف قرآن کے اصول و احکام ہیں جو سیاسی اور معاشی زندگی میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اسلامی مملکت قرآن کے اصول و احکام کی تنفیذ کی ایجنسی کا دوسرا نام ہے۔

اس سے واضح ہے کہ پاکستان کا تصور کسی علاقائی نیشنلزم پر مبنی نہیں تھا۔ اسلام نے علاقائی نسبتوں کو انسان کے بلند جذبات کا محور بنایا ہی نہیں۔ اس نے اس کی اہمیت صرف افادی حد تک رکھی ہے۔ بنا بریں پاکستان مقصود بالذات

نہیں تھا۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ جس طرح ہمارے لئے آزادی اور حریت کے الفاظ محض شاعری نہیں تھے (ان کا مفہوم اس سے کہیں گہرا تھا) اسی طرح مملکتِ پاکستان کا تصور ہمارے نزدیک محض جذباتی نہیں تھا۔ ہم نے آزادی اس لئے چاہی تھی، ہم نے پاکستان اس لئے مانگا اور حاصل کیا تھا، کہ ہم اس خطۂ زمین میں اُس آئیڈیالوجی کو عملاً متشکل کرنے کے قابل ہو سکیں، جو ان تمام مصائب و مشکلات کا آخری اور مؤثر ترین حل پیش کرتی ہے جنہیں حضرت انسان کی دانائیوں اور ہوشمندیوں نے خیر سے اپنے لئے وبالِ جان بنا رکھا ہے۔ اس مملکت کو ساری دنیا کے لئے ایک مثالی مملکت بننا تھا ــــ اُس دنیا کے لئے جس کا ہر تجربہ، انسانی زندگی کی خود پیدا کردہ گتھیاں سلجھانے میں بری طرح ناکام رہا ہے ــ جن عظیم ہستیوں نے پاکستان کا تصور دیا یا اس کے حصول کے لئے انتھک کوششیں کیں، ان کے پیشِ نظر یہ نہ تھا کہ دنیا کی 'بزعم خویش' آزاد مملکتوں کی فہرست میں ایک اور نام کا اضافہ کر دیا جائے۔ اسے تو انسان کی ان مقدس آرزوؤں کا محور اور حسین تمناؤں کا پیکر بننا تھا جنہیں وہ زندگی کی عزیز ترین متاع تصور کرتا ہے ــــ یعنی سیاسی، معاشی اور معاشرتی گوشوں میں صحیح عدل، آزادی، مساوات اور امن و عافیت کا ایسا گہرا احساس جو انسانی قلب کو جنت در آغوش بنا دیتا ہے ــ یہ حسین و شاداب تصورات جنہیں انسان نے اپنے خوابوں میں تو دیکھا تھا لیکن جنہیں وہ اپنی جیتی جاگتی دنیا میں، خراماں خراماں ارم دیکھنے کے لئے ہمہ تن شوق و اضطراب تھا، اس مملکت میں زندہ حقیقتیں بن کر سامنے آنے والے تھے ــ ہاں! پاکستان کا مقصد یہی تھا۔ اسے اسی لئے مانگا اور حاصل کیا گیا تھا۔

جب پاکستان حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا گیا تھا تو ظاہر ہے کہ اس کے حصول کے بعد، اس کے سوا کوئی اور مقصد ہمارے سامنے ہونا ہی نہیں چاہئے تھا کہ اس آئیڈیالوجی کو کس طرح محسوس پیکر عطا کئے جائیں جس کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا ہے ــ یہ ہونا چاہئے تھا، اور ایسا ہو کر رہتا اگر وہ عظیم انسان جس نے پاکستان حاصل کیا تھا، زندہ رہتا ــــ لیکن وہ اس سرزمین کو دیکر خود ہم سے جدا ہو گیا اور اس کے بعد ہم نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ اس مملکت کو اُس کلچر کا قالب بننا تھا جس کے خط و خال اسلام نے بایں حسن و خوبی متعین کئے تھے۔ ہم نے ان خطوط پر سوچنا ہی چھوڑ دیا، اور ذریعہ کو مقصود بالذات سمجھ کر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ــــ اُس خود فریب مسافر کی طرح جو ریل کا ٹکٹ خرید کر گھر میں بیٹھ رہے اور یہ سمجھتا رہے کہ وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں جا رہا ہے۔

اس سے بھی بڑا نقصان یہ ہوا کہ وہ طبقہ جس کے متعلق غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ بڑا صاحب علم و بصیرت اور عقل و ہوش ہے، اس نے یہ سمجھ لیا کہ اسلامی مملکت سے مراد اس انداز کی حکومت ہے جو سعودی عرب میں قائم ہے اب ظاہر ہے کہ جب اسلامی حکومت کا اس قسم کا نقشہ ذہن میں آجائے تو اُس کے خلاف حقارت بلکہ سرکشی کے جذبات کا بیدار ہو جانا، فطری امر ہے ــــ وراثتی بادشاہت کی بدعنوانیاں۔ غلاموں اور لونڈیوں کی منڈیاں۔ امراء و رؤسا کے حرم ــ یہ تھیں وہ "برکات و حسنات" جو اسلامی حکومت کے تصور کے جلو میں، ذہن کے سامنے آتی تھیں۔ آپ

خود ہی سوچئے کہ وہ کونسا صاحب عقل و ہوش ہوگا جو اس قسم کی حکومت کو بلا بلا کر اپنے گلے کا ہار بنالے۔ سعودی عرب جیسی حکومت کو اسلامی حکومت کا تماثل قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اسلامی حکومت کے تصور سے ندامت محسوس ہونے لگ گئی۔ اس گروہ نے اتنی تکلیف ہی گوارا نہ کی کہ یہ معلوم کرے کہ اسلامی مملکت کہتے کسے ہیں اور جس حکومت کو وہ اسلامی سمجھ رہے ہیں اُسے صحیح اسلامی حکومت سے کوئی تعلق اور واسطہ بھی ہے؟ لیکن انہیں ایسا سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی! شاید ان میں سوچنے کا مادہ ہی نہیں تھا۔

اس گروہ سے بھی زیادہ خرابی کا باعث ایک اور گروہ تھا۔ یہ گروہ مذہبی پیشوائیت کا تھا جس نے اُس مقصد کے مسخ کرنے میں جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا، سب سے زیادہ سعی و کاوش کی تھی، اور اب تک مصروفِ کاوش ہے۔ انہوں نے اسلام کو بھیانک توہم پرستیوں اور مضحکہ انگیز رسوم دشت عقل کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ انہوں نے اسلامی مملکت کا جو تصور پیش کیا وہ زمانہ" تاریکی کی تھیا کریٹک اسٹیٹ کا تصور تھا اگرچہ قائداعظم نے اس حقیقت کو نکھار اور ابھار کر واضح کر دیا تھا کہ" کچھ بھی ہو، پاکستان ایک تھیا کریٹک اسٹیٹ کبھی نہیں بنے گا۔ جس میں مذہبی مقدسین خدا کے نام پر اپنی من مانی کرنے کے لئے کھلے چھوڑ دیئے جائیں"۔ ہماری بدقسمتی کہ ایسا کہنے والا تو چلا گیا اور اس نے جو یہ کہہ دیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوگی، ان الفاظ' کا ان مقدس مفاد پرستوں نے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ انہوں نے سادہ لوح مسلمان کو اس منطقی بھول بھلیاں میں الجھا دیا کہ

پاکستان میں اسلامی مملکت قائم ہوگی۔
اسلام کا جاننے پہچاننے والا ہمارے سوا اور کون ہے۔ لہٰذا
مملکت ہمارے حوالے کردو تاکہ ہم اسے اسلامی بنا دیں۔

اب آپ سوچئے کہ جس ملک کی کثیر آبادی مذہب پرست ہو۔ اور ان میں اس قسم کے خیالات عام کر دیئے جائیں، اس ملک میں آزادانہ طور پر کچھ سوچنے کی گنجائش بھی رہ سکتی ہے؟ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو طبقہ یا گروہ ایک دفعہ کسی نہ کسی طرح اقتدار حاصل کرلے، وہ اسے چھوڑنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس کے تحفظ کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کرے گا۔ ان میں سب سے زیادہ موثر حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس معاشرہ کے لئے ایک ایسا ضابطہ کردار وضع کرتا ہے جو اس کی اپنی منفعت اور مفاد پرستی کا ضامن بنا رہے۔ وہ معاشرہ کے غیر منظم طبقہ (یعنی عوام) کی سہل انگاری اور سہولت پسندی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے ــــ اگر کہیں سے کوئی ایسی بات اُٹھے جو اس مفاد پرست طبقہ کے خلاف جاتی ہو تو یہ عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیتے ہیں۔ اب آپ ہی بتایئے کہ ان حالات میں عقل و فکر کی رو سے سوچنے اور علم و بصیرت کی روشنی میں حالات کا جائزہ لینے کی ذرا سی بھی اجازت مل سکتی ہے؟ جس فضا میں ہر خطبہ میں یہ آواز کانوں میں ڈالی جائے کہ کل بدعۃ ضلالۃ۔ و کل ضلالۃ فی النار۔ ہر نئی بات گمراہی ہے اور ہر گمراہی انسان کو جہنم میں دھکیل دیتی ہے ــــ وہاں ندرت

فکر و عمل کا تصور تک انسان کا گلا گھونٹ دینے کے لئے کافی ہے۔ ہمارے مذہبی پیشواؤں کے نزدیک "جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے" اس سے ایک قدم بھی اِدھر اُدھر ہٹنا کسقدر گناہِ عظیم کا باعث ہے۔ اس کا اندازہ ایک تاریخی واقعہ سے لگائیے۔ دمشق میں امیہ کے زمانے میں بہت بڑی جامع مسجد تعمیر ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انجنیروں کی ایک جماعت نے 'علمی قاعدے کی رو سے یہ معلوم کیا کہ اس مسجد کا' اور جو مساجد اس مسجد کے تتبع میں بنائی گئی ہیں ان کا رخ صحیح نہیں۔ یہ ایک خالص علمی مسئلہ تھا جسے علمی نہج سے طے ہونا چاہئیے تھا۔ لیکن علمائے کرام کی ایک جماعت نے اسے اپنا مذہبی مسئلہ بنا لیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ اس مسجد کا رخ صحیح نہیں' تو اس سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسوقت تک ہمارے اسلاف نے جسقدر نمازیں اس مسجد کے رخ پر پڑھی ہیں' وہ سب باطل تھیں' ایسا تصور کرنا ان بزرگوں کی شان میں گستاخی ہے۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم یہ کہدیں کہ یہ انجنیر صحیح نہیں کہتے۔ چنانچہ انہوں نے 'بزرگان سلف کی نمازوں کو محفوظ رکھنے کے لئے فتوےٰ دیدیا کہ اُن مساجد کا رخ بدلا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ وہ مساجد اسی طرح رہیں۔

اب آپ سوچئے کہ جہاں کیفیت یہ ہو وہاں علم و عقل کی رسائی کسی طرح بھی ممکن ہے! چنانچہ ہمارے مقدس مُلّا کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ عقل بیچاری کی اس طرح مرمت کی جائے کہ اگر وہ (مُلّا) دن کو رات کہے تو یہ بھی اسے شب تاریک کہدے۔ اور وہ اگر شام کو صبح کہے تو یہ اسے صبح درخشندہ کہنے لگ جائے۔ یہ ہے "خدا اور رسول" کے نام کا وہ ڈنڈا جس سے مُلّا عوام کے گلے کو ہانکتا رہتا ہے اور اسے جس طرف جی چاہے لئے لئے پھرتا ہے۔ ان حالات میں انسانی فکر۔ تخلیق تو۔ آزادانہ غور و تدبر اور علمی فیصلوں کے دئے خود بخود گل ہو جاتے ہیں۔ ایسی سوسائٹی میں' مسلمہ عقائد اور موروثی تعلیم کا داروغہ ہر وقت ذہن انسانی کے سر پر مسلط رہتا ہے۔ اس ڈنڈے کا خوف' غیر شعوری طور پر سچی دلیل کے خلاف جھوٹی دلیل۔ اور ہر صحیح ثبوت کے خلاف جھوٹا ثبوت بن کر ذہن انسانی پر منڈلاتا رہتا ہے۔ اسلامی مملکت کا منتہیٰ و مقصود انسانی ذات کی نشو و نما تھا۔ لیکن ذرا سوچئیے' خواتین و حضرات! اس قسم کے فکری استبداد کے ماحول میں انسانی ذات کی نشو و نما کے لئے کوئی موقعہ بھی میسر آسکتا ہے؟ جون سٹوارٹ مِل نے کس قدر صحیح کہا تھا کہ

> جس معاشرہ میں ہر اس تحقیق کے دروازے بند کر دیئے جائیں جس کے نتائج قدامت پرست طبقہ کے معتقدات کی تائید نہ کرتے ہوں' اس میں ملحدین کے دل و دماغ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کا سب سے زیادہ نقصان لوگوں کو پہنچتا ہے جو ملحد اور بے دین نہیں ہوتے۔ ان کے دل و دماغ پر ہر وقت یہ خوف مسلط رہتا ہے کہ ان پر کہیں کفر کا فتوےٰ نہ لگ جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں آزادانہ غور و فکر کی صلاحیتیں مفلوج اور سوچنے سمجھنے کی قوتیں مصلوب ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ کون ہے جو ہمیں اس کا حساب کر کے بتا سکے کہ دنیا کو اس سے کس قدر نقصان پہنچتا ہے کہ

نہایت ہونہار۔ ہوشمندوں کا گروہ عظیم ہے لیکن ان میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ ان توانا اور آزاد خیالات کا اتباع کر سکیں جو انہیں ان منازل کی طرف لے جائیں جنہیں قدامت پرست طبقہ خلاف مذہب یا خلاف اخلاق قرار دے رہا ہو۔

اس سے آگے چل کر وہ لکھتا ہے۔

اگر حالات ایسے ہوں جن میں آزادانہ فکر و تحقیق کرنے والے طبقہ کی اکثریت یہی مناسب سمجھے کہ جن اصول و نظریات کو انہوں نے صحیح سمجھا اور درست پایا ہے انہیں اپنے دل کی چار دیواری کے اندر مقید رکھیں اور جو کچھ پبلک کے سامنے پیش کریں اس میں اس بات کی کوشش کریں کہ جن نتائج پر ان کے آزادانہ فکر و تدبر نے انہیں پہنچایا ہے ان میں سے صرف اتنے حصے کو زبان پر لائیں اور اُسے ان نتائج کے چوکھٹے میں فٹ کر کے پیش کریں جنہیں وہ اپنے دل سے مسترد قرار دے چکے ہیں۔۔ ایسے حالات میں اس قسم کے جرأت مندانہ کردار کے انسان کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں جو کبھی دنیائے عقل و فکر کے لئے وجہ زیبائش تھے۔ ایسے ماحول کی پیداوار وہی انسان ہو سکتے ہیں جو یا تو پامال راہوں پر آنکھ بند کر کے چلتے جائیں۔ یا جو موقعہ پرست ہوں اور اپنے مخاطبین کو خوش کرنے کے لئے وہ کچھ کہتے رہیں جسے ان کا دل صحیح نہیں مانتا۔ اور جس بات کو وہ خود صحیح تسلیم کریں اسے ان کی مصلحت بینی زبان پر نہ لانے دے۔

یہ ہے، خواتین و حضرات! ذہنی قید خانہ کی وہ تنگ و تاریک کوٹھڑی جس میں پاکستان کی زندہ آئیڈیالوجی محبوس ہو کر رہ گئی ہے اور جہاں وہ ایک جیتا جاگتا شعلۂ جوالہ بننے کے بجائے، راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ جس بات پر بلا سوچے سمجھے، آنکھ بند کر کے چلا جائے، کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنی موت آپ مر جاتی ہے جس درخت کو زندہ رکھنا مقصود ہو اس کی جڑوں کی آبیاری ضروری ہے۔ اگر کسی درخت کی خشک شاخوں کے ساتھ، مردہ پتے گوند سے چپکا دیئے جائیں تو کیا ایسا درخت موسم بہار کی نسیم جانفزا سے کبھی سر سبز و شاداب ہو سکتا ہے؟ سوچئے کہ یہ گہری سوچ کا مقام ہے۔

ایسے حوصلہ شکن حالات میں قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے ساتھ توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری تعلیم کا نظام ایسا ناقص ہے کہ اس سے کوئی مفید مطلب نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اس سے مختلف قسم کی معلومات تو فراہم کر دی جاتی ہیں۔ لیکن طلباء میں وہ نگاہ نہیں پیدا کی جاتی جس سے وہ ان معلومات کی صحیح اقدار متعین کر سکیں۔ بھلا سوچئے کہ ایسے تجربہ سے فائدہ کیا جس کے مفہوم و مقصود سے ہم ناواقف ہوں۔ ہماری نئی نسل کے دل سے قدیم اقدار کی اہمیت ختم ہو چکی ہے اور ہم نے ان کی جگہ کوئی نئی اقدار انہیں دی نہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ، ایک تخریبی ادا منفیانہ ذہنیت کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

زندگی کچھ مثبت طور پر حاصل کرنا چاہتی ہے محض "یہ نہ کرو - اور وہ نہ کرو" سے وہ مطمئن نہیں ہو سکتی - جس رونے کے بعد افطاری نہیں اس کا نتیجہ زود یا بدیر موت ہے - وہی انسان متاعِ انسانیت میں کوئی مفید اضافہ کر سکتا ہے جو یہ جانتا ہو کہ اس کی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور کاروان انسانیت کی منزل کونسی ہے - اس کے سامنے یہ حقائق اسی صورت میں آسکتے ہیں جب اسے زندگی کی مطلق اقدار کی تعلیم دی جائے - اگر نوجوانوں کو ان اقدار کی تعلیم نہ دی جائے تو وہ ہر جھکڑ کے ساتھ اڑنے اور ہر سیلاب کے ساتھ بہتے چلے جائیں گے - اور اس پر ہمیں نہ حیرت ہونی چاہئے نہ تاسف -

لیکن حالات کی اس تمام ناسازگاری کے باوجود ہمیں نا امیدی کا شکار نہیں ہو جانا چاہئے - کامیابی منزل پر پہنچ جانے ہی کو نہیں کہتے - منزل کی طرف جو قدم بھی اٹھتا ہے وہ کامیابی کی دلیل بنتا چلا جاتا ہے - سقراط کی موت اس کی ناکامی نہیں تھی - اس سے وہ بلند اصول زندہ ہو گیا تھا جس کے لئے سقراط نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی - اس سے ظاہر ہے کہ

حق کی آواز کبھی صدا بصحرا ثابت نہیں ہوتی -

طلوع اسلام کی تحریک کو مخالفتوں کا سامنا ضرور کرنا پڑا ہے - لیکن اس نے ان کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے - یہ سینہ سپر ہو کر آگے بڑھتی گئی - اور یہ اسٹیج جس سے ہم حق کی آواز کو بلا دھڑک بلند کرنے کے قابل ہو گئے ہیں، اس کی کامیابی کی زندہ دلیل ہے -

---

اِسلام کیا ہے

ادارہ کی اس جدید پیشکش کے لئے بہت سی فرمائشیں جمع ہو گئی تھیں - ایک تو فرمائشوں کی کثرت اور دوسرے ہماری کنونشن کی وجہ سے مصروفیات کی بنا پر - اب ان تمام فرمائشوں کی تعمیل ہو چکی ہے - جن احباب کو اس سلسلہ میں زحمتِ کشِ انتظار ہونا پڑا ہے ہم ان سے معذرت خواہ ہیں - جدید فرمائشوں کی تعمیل ساتھ کے ساتھ ہوتی رہے گی اسکے اعلےٰ ایڈیشن کی قیمت آٹھ روپے اور جیب ایڈیشن کی چار روپے ہے - فرمائش بھیجتے وقت تصریح کر دی جائے کہ کونسا ایڈیشن مطلوب ہے -

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوع اسلام ۲۵/ بی - گل برگ - لاہور

محترم جاوید رحیم

(۴)

ذمہ داری سے فرار؟

اختیار و ارادہ کی صلاحیت ہی انسان کو دوسری مخلوق سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی صلاحیت کی بدولت انسان آج اس مقام پر کھڑا ہے۔ کہ کائنات کی قوتیں اس کے سامنے سرنگوں ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن جہاں انسان کو اختیار و ارادہ کی صلاحیت دی گئی وہاں اس کو اپنے ہر عمل کی ذمہ داری بھی قبول کرنی پڑی اور یہ بات حضرتِ انسان پر کچھ ناگوار گذری چنانچہ تاریخ انسانی بتاتی ہے کہ اس ذمہ داری سے فرار کے لئے اس نے کس کس قسم کی راہیں تلاش کیں۔

ہندوؤں کے ہاں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ انسان کی پیدائش اپنے پچھلے جنم کے اعمال کے مطابق ہوتی ہے۔ اگر پچھلے جنم میں اعمال اچھے کئے ہونگے تو وہ برہمنوں یا کشتریوں کے ہاں یعنی اونچے طبقے میں پیدا ہوگا۔ اور اگر اعمال برے ہونگے تو وہ نچلے طبقے یعنی ویش یا شودروں کے ہاں پیدا ہوگا۔ اس طرح محض پیدائش کے اعتبار سے ایک انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا اور ہر قسم کا ظلم و ستم روا رکھنے کا حق حاصل ہوگیا کیونکہ اس کی ذمہ داری برہما پر عائد کر دی گئی جس کے کائناتی پروگرام کے لئے انسان کی اپنی حیثیت محض ذرائع کی سمجھی گئی۔

عیسائیوں میں اسی مقصد کے لئے کئی عقائد وضع کئے گئے۔ ایک عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اوّلین ماں باپ کا گناہ لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔ اور تمام خرابیاں اسی گناہ کا نتیجہ ہیں۔ اس طرح افراد اپنے برے اعمال کی براہِ راست ذمہ داری سے بچ گئے۔ دوسرا عقیدہ بادشاہوں کے آسمانی حقوق (DIVINE RIGHTS OF KINGS) کے متعلق وضع کیا گیا۔ جس کی رو سے بادشاہوں کو اپنے ظلم و ستم کی ذمہ داری سے چھٹکارا حاصل ہوگیا۔ غریبوں کو یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ اس دنیا کے دکھوں یا تکلیفوں سے چاہے چھٹکارا ہو یا نہ ہو۔ لیکن آسمان کی بادشاہت اُن ہی کا حصہ ہے۔ اور انہیں چاہیئے کہ صبر و شکر سے یہ سختیاں جھیل جائیں۔ بلکہ جو جسقدر زیادہ سختیاں جھیلے گا اسی قدر زیادہ خدا کا مقرب ہوگا۔ اس طرح عوام بھی اس ذمہ داری سے بری ہوگئے کہ انہوں نے ظلم و ستم کرنے والوں کے خلاف علمِ بغاوت کیوں

نہیں جلند کیا۔

مجوسیوں کا وضع کردہ عقیدہ تقدیر اسی سلسلے کی اگلی کڑی ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے انسان جو کچھ بھی اس دنیا میں کرتا ہے۔ وہ اس کی پیدائش سے بہت پہلے ہی لکھا جا چکا ہوتا ہے۔ اس طرح ہر انسان اپنے اعمال کی ذمہ داری سے نہایت آسانی سے چھوٹ گیا۔

باطنیت یا " ہمہ اوستی " نظریہ کی رو سے انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس میں علت (CAUSE) بھی خدا ہوتا ہے اور معلول (EFFECT) بھی خدا۔ قاتل بھی وہی اور مقتول بھی وہی۔ اس لئے اس میں انسان کی اپنی ذمہ داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد " راضی برضا " کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ جس کی رو سے یہ کہا جاتا ہے۔ کہ انسان کو ہر حال پر مطمئن رہنا چاہیئے۔ کیونکہ مرضی مولا اسکی اسی حالت میں ہے۔

حضرات آپ نے دیکھ لیا کہ انسان اپنے اختیار وارادہ کے بغیر اختیار وارادہ کا مالک تو بن گیا لیکن اپنے اعمال کی ذمہ داری سے بچنے کے لئے اس نے کس کس نے قسم کی راہیں تراشیں چین کے لوگ شاید ان تمام لوگوں سے زیادہ چالاک تھے انہوں نے ذمہ داری سے بچنے کا آسان راستہ یہ اختیار کیا کہ خود کوئی فیصلہ نہ کرو۔ جو کچھ اسلاف فیصلہ کر چکے ہوں اسکو قبول کرلو۔ اگر اس فیصلہ میں کوئی خرابی ہوگی تو اس کے ذمہ دار اسلاف ہی ہونگے اس طرح نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری کے مصداق نہ تو خود فیصلہ کرنا پڑے گا اور نہ ہی ذمہ داری عائد ہوگی۔

یہ تو ہیں زمانۂ قدیم کے نظریات جو ہمیں ورثہ کے طور پر ملے ہیں۔ لیکن دور حاضرہ میں بھی جو علوم اور روشنی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے انسان کو مجبور محض ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً ماہرین علم الحیات (BIoLogists) کی تحقیق نے انہیں اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ ہر فرد اپنے ساتھ " پیدائشی طور پر بعض خلیے اور غدود اس قسم کے لاتا ہے جن سے اس کا کردار مرتب ہوتا ہے۔ لہذا جو کچھ وہ کرتا ہے اس میں اس کے اختیار وارادہ کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح جیسے مُسے اس پر کچھ اختیار نہیں ہوتا کہ اس کی جلد کا رنگ کیسا ہے یا آنکھوں کی ساخت کیسی ہے۔

علمائے عمرانیات (SocioLigists) کی تحقیق نے انہیں اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ انسان اپنے صدیوں پہلے کے آباؤ اجداد کی خصوصیات اپنے ساتھ لاتا ہے۔ جنہیں تبدیل کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کا پورا کردار انہیں موروثی اثرات کا مجموعہ ہوتا ہے۔

ماہرین علم النفس (PsYCHOLOGISTS) کی تحقیق یہ ہے کہ انسان نے جو کچھ بننا ہوتا ہے۔ وہ اپنی پیدائش کے پہلے دو تین سال میں بن چکتا ہے۔ اس زمانے کے تاثرات اس کے تحت الشعور میں اس طرح جاگزین ہو جاتے ہیں۔ کہ اس کا اس کو مطلق احساس نہیں ہوتا لیکن بعد میں اس کا ہر فیصلہ اور عمل انہیں تاثرات کا ردّ عمل ہوتا ہے اس لئے وہ ان کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

مارکسزم (MARXISM) کے نظریات کے مطابق انسان اپنے معاشی ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ جس کو بدلنا اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ ان نظاہائے معاشیات میں تبدیلی تاریخی وجوب (HISTORICAL-NECESSITY) کے تحت ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ہمارے ہاں اس فرار کے لئے ایک انوکھا چور دروازہ موجود ہے۔ بہرحال یہ اتنا انوکھا بھی نہیں اور آپ حضرات اس سے بخوبی واقف ہونگے۔ اس کی صورت اس طرح ہے کہ آپ کو اپنی من مانی کرنے کی اجازت ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے کیونکہ انسان کو صاحبِ اختیار وارادہ بنایا گیا ہے۔ انسان ہر کام اپنے اختیار وارادہ سے کرتا ہے اور اسے کسی قیمت پر ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا۔ لیکن اس کے بعد حالات ذرا مختلف ہوجاتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اگر آپ نے اوکھلی میں سر دے دیا تو موصلی کے لئے بھی تیار رہتے اور اگر آپ موصلی سے بچنا ہی چاہتے ہوں تو اس کا طریقہ صرف یہی ہے کہ آپ اوکھلی میں سر نہ دیں لیکن یہاں پر بتایا یہ جاتا ہے کہ موصلی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی پیر کے مرید بن جاؤ یا کسی خانقاہ پر جاکر ماتھا ٹیک دو اور پھر موصلی بے اثر ہو جائے گی۔

اس کی دوسری شکل طلباء میں رائج ہے اور وہ اس طرح کہ طلباء کا سب سے اہم مسئلہ امتحان ہوتا ہے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ یہ مسئلہ ان طلباء کے لئے اتنا شدید نہیں ہوتا جو اس کے لئے پہلے سے تیار ہوں۔ لیکن مصیبت تو اُن طلباء پر ٹوٹتی ہے جو اس کے لئے تیار نہیں ہوتے اور جو سال بھر دوسرے مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ چنانچہ جب امتحان قریب آتا ہے تو بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ یوں تو مسجد کی طرف شاید سال بھر آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ہو لیکن پھر مسجد کا پانچوں وقت ورد شروع ہوجاتا ہے۔ امتحان اور قریب آتا ہے تو خانقاہوں پر مرادیں مانی جاتی ہیں۔ جب امتحان اور زیادہ قریب آتا ہے تو ٹیوٹر کرنا چھوڑ دیا جاتا ہے اور آدمی نہایت پارسا نظر آنے لگتا ہے۔ یہ تو خیر امتحان کی تیاری تھی لیکن نتیجے کا انتظار اس طرح ہوتا ہے کہ میں نے ایک دفعہ اپنے ایک دوست سے فلم پر چلنے کو کہا جبکہ نتیجہ نکلنے میں شاید ایک یا دو دن باقی تھے۔ اُن صاحب پر ابھی پارسائی کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ چنانچہ فرمانے لگے کہ نہیں نتیجہ نکلنے دو پھر چلیں گے۔ کہیں فلم دیکھنے سے خدا ناراض ہوگیا تو نتیجہ خراب ہوجائے گا۔ لاکھ سمجھایا کہ جو کچھ کرنا تھا وہ تو امتحان میں کر آئے اور نتیجہ بھی مرتب ہوچکا اب تو پارسائی کا نقاب اتار دو۔ لیکن اس دلیل کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ ابھی اُن کا چلہ پورا نہیں ہوا تھا۔

حضرات! آپ نے دیکھا کہ ہر نظریہ کے پس پردہ چاہے وہ قدیم ہو یا جدید، انسان کی یہی کوشش جلوہ فگن نظر آتی ہے کہ خود کو اپنے اعمال کی ذمہ داری سے مستثنیٰ قرار دے لے یا ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کی کوئی آسان راہ آجائے جس کی تلاش میں لوگ خانقاہوں وغیرہ پہ بھٹکتے پھرتے ہیں ان تمام نظریات کے برعکس قرآن نے ایک نیا نظریہ پیش کیا جو انسان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کرا کے اس کی کھوئی انسانیت کو بحال کر دیتا ہے۔

سب سے پہلے قرآن کی اس آیت کو لیجیئے جس میں کہا گیا ہے ۔ کہ

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ۝

ہم نے اسے راستہ دکھا دیا۔ اب اس کا جی چاہے تو اسے اختیار کرے اور جی چاہے اس سے انکار کرکے غلط راہوں پر چل نکلے۔

ایک اور جگہ یوں آیا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ (۴۱/۴۰) جو تمہارا جی چاہے کرو۔ لیکن اتنا یاد رکھو کہ

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ط (۴۱/۴۶)

جو شخص اچھے کام کرے گا اس کا فائدہ خود اس کو ہوگا۔ جو برے کام کرے گا اس کا نتیجہ بھی اسے ہی بھگتنا پڑے گا۔ اور اس کا فیصلہ اس طرح ہوگا کہ

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۹۹/۷-۸)

جو ذرہ برابر بھی عمل خیر کرے گا وہ اس کے سامنے آجائے گا اور جو ذرہ برابر برا کام کرے گا وہ بھی اس کے سامنے آجائے گا۔

کسی کی دوستی۔ سفارش۔ فدیہ یا کفارہ نیکیوں کو زیادہ اور برائیوں کو کم نہیں کرسکتی۔ کیونکہ

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ (۶/۱۶۵)

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

جو لوگ یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں، کہ اگر خدا کو منظور ہوتا تو ایسا کبھی نہ ہوتا وہ انہیں بڑی سختی سے روکتا ہے۔ سورۃ یٰسین میں آتا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ (۳۶/۴۷)

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے تمہیں رزق دیا ہے۔ اسے محتاجوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کھلا رکھو، تو جو لوگ کفر کی روش اختیار کئے ہیں وہ مومنین سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے شخص کی روزی کا انتظام کریں کہ اللہ چاہتا تو وہ اس کی روزی کا خود انتظام کر دیتا۔ (یعنی وہ پہلے غلط معاشی نظام قائم کر لیتے ہیں جس میں لوگ بھوکے مریں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ان بھوکوں کی روٹی کا انتظام کیوں نہیں کرتے تو کہتے ہیں کہ خدا کی مرضی ہی ایسی ہے کہ یہ بھوکے رہیں۔ اگر اس کی ایسی مرضی نہ ہوتی تو یہ کبھی بھوکے نہ رہتے۔ ہم خدا کی مرضی کے خلاف کس طرح کر سکتے ہیں) قرآن کہتا ہے کہ

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۶/۴۷)

ان سے کہو کہ یہ کتنی گمراہی کی بات ہے جو تم کر رہے ہو۔

اسلاف پرستی کے خلاف بھی قرآن میں کئی آیات ہیں چنانچہ ایک مقام پر قرآن اسلاف کے بارے میں یوں واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ ج

یہ ایک جماعت تھی جو اپنا وقت پورا کر کے دنیا سے چلی گئی۔

لَہَا مَا کَسَبَتْ وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ ج

جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لئے تھا جو کچھ تم کرو گے۔ وہ تمہارے لئے ہوگا۔

وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ (۲/۱۳۴)

تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے عمل اور فیصلہ کے ذمہ دار تھے۔ تم اپنے عمل اور فیصلے کے ذمہ دار ہو۔ تم یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے کہ ہم نے اسلاف کے فیصلے کے مطابق عمل کیا ہے۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ جس فیصلے کے مطابق تم نے عمل کیا ہے اس کے صحیح ہونے کی تمہارے پاس کیا دلیل ہے۔ وہ اہل جہنم کے اس عذر کو قابل قبول قرار نہیں دیتا کہ

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا (۳۳/۶۷)

اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی تھی اور انہوں نے ہمیں صحیح راستہ سے گمراہ کر دیا تھا۔ اس لئے ہماری گمراہی کے ذمہ دار وہ ہیں۔ ہم نہیں۔

ان آیات سے انسان کے اختیار و ارادہ اور اعمال کے نتائج کے متعلق قرآن کا نظریہ بالکل واضح ہو جاتا ہے جس کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

اس کائنات کا نظم و نسق اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے تحت ہو رہا ہے۔ یہ قوانین ایسے محکم اور اٹل ہیں کہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ذرا سی تبدیلی بھی اس محیر العقول نظام کو درہم برہم کر سکتی ہے۔ لیکن یہ وہ قوانین ہیں جن کا تعلق ہماری طبعی زندگی سے ہے۔ خود ہماری انسانی زندگی سے متعلق بھی خدا نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ جن کا علم ہمیں وحی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ان قوانین کے ذریعہ ہماری ذات کی نشو و نما ہوتی ہے، اس طرح کہ ہمارا ہر عمل نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ جس کا اثر ہماری ذات پر ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو کوئی رعایت نہیں مل سکتی۔ کیونکہ پیدائشی اعتبار سے ایک انسان کو دوسرے انسان پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ انسان کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ جو راستہ چاہے منتخب کرے لیکن اس کا فائدہ یا نقصان صرف اسی کو ہوگا۔ برہمن یا کشتری کے ہاں پیدا ہونے

سے اس کو کوئی خاص حقوق یا مراعات نہیں مل جاتے اور نہ ہی دیش یا شودر کے ہاں پیدا ہونا باعث جرم ہو جاتا ہے۔

تقدیر ہمارے اپنے اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ ہمارے راستے کا تعین پہلے سے ہی ہو چکا ہے۔ اور ہم ایک اندھی قوت کے تحت اسی طرف دھکیلے جا رہے ہیں۔ اگر انسان کوئی غلط قدم اُٹھائے تو صحیح قدم اس غلطی کا ازالہ بھی کر سکتا ہے۔

اب رہا فرد کی طبعی ساخت۔ موروثی خصائص۔ بچپن کے تاثرات والے نظریات تو اس میں شک نہیں کہ یہ تمام چیزیں ہمارے عمل و کردار پر کسی حد تک اثر انداز ہو سکتی ہیں لیکن خدا نے ہمیں ایک ایسی چیز عطا کی ہے جو ان تمام پر غالب آ سکتی ہے بشرطیکہ اس کا صحیح استعمال کیا جائے اور اس کو خدا کے قوانین کے تابع رکھا جائے۔ اور وہ چیز ہے خود انسانی ذات جسے قرآن "الوہیاتی توانائی" کہہ کر پکارتا ہے۔

جو لوگ اسلاف کے فیصلوں کی آڑ لے کر اپنے اعمال کی ذمہ داری سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی ایک بہت بڑی خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ قرآن ہر نسل کو اس کے اعمال کا خود ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اسلاف کے فیصلوں کو بلا چون و چرا قبول کرنے کی بجائے اسے قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں۔ اگر وہ اس پر پورے اتریں تو ٹھیک ورنہ ان فیصلوں کو رد کر دینے میں ہمیں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ فیصلوں کے تباہ کن نتائج کا اثر تو ہم پر ہی پڑتا ہے۔

حضرات! آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کس طرح زندگی کے ہر گوشے میں ہمیں اپنی ذمہ داری کا احساس دلاتا چلا جاتا ہے۔ اب یہ ہم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہ ہم اپنے اختیار و ارادہ کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کو قبول کر لیں یا رد کر دیں۔ لیکن اس کو قبول کرنے سے ہمیں ہی فائدہ ہوگا اور اس کو رد کرنے سے ہم ہی گھاٹے میں رہیں گے۔

اس زمانے میں جبکہ دنیا بھر کے مسلمانوں، سینکڑوں برس سے تقدیر اور اسلاف پرستی کے عقائد کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے اپنے اعمال کے نتائج کی ذمہ داری سے بچنے کی راہوں پر چلے جا رہے تھے۔ اور اپنے آپ کو فریب میں رکھ رہے تھے کہ ہم اسلام کے صحیح راستے پر چل رہے ہیں، طلوع اسلام نے قرآن کی اس تعلیم کو بے نقاب کیا جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے تقدیر کو بہانہ بنا کر عمل سے بے نیاز ہونے والے مسلمان کی طرف سے اس آواز کی مخالفت ہوئی تھی۔ وہ ہوئی اور بڑی سخت ہوئی لیکن اس آواز کے اندر اتنی قوت تھی کہ یہ باوجود مخالفتوں کے باوجود آگے بڑھتی گئی۔ اور میں آج پورے حتم و یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ اب اس تقدیری افیون کا شکار نہیں ہو سکتا۔ حقیقت اس کے سامنے آ چکی ہے۔ اور اب خود فراموشی کے باطل تصورات اسے پھر تاریکیوں میں نہیں لے جا سکتے۔ طلوع اسلام کا یہ ہم پر بڑا ہی احسان ہے جس کے اعتراف و اظہار کے لئے میں آپ کے سامنے آیا ہوں۔ اب اس کی یہ آواز دب نہیں سکتی۔

ڈاکٹر مس رشیدہ

(۵)

معاشی موانعات

صدر محترمہ - میری عزیز بہنو اور بھائیو

حق اور صداقت کے راستے میں جس قدر رکاوٹیں آتی ہیں ان کا تفصیلی تذکرہ آپ نے مختلف تقریروں میں سن لیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے ایک ایک رکاوٹ دور کرنے کے لئے بڑی ہمت اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچپن کے خیالات تعلیم وتربیت کے اثرات۔ ماحول کے تقاضے۔ سوسائٹی کا دباؤ، مذہب کی گرفت، یہ سب اپنی اپنی جگہ گو پتھر کی دیواریں ہیں، جو حق وصداقت کے راستے پر چلنے والے کے سامنے قدم قدم پر آتی ہیں۔ لیکن ان دیواروں کو راستے سے ہٹاتے یا پھاند کر آگے بڑھ جانے کے لئے صحیح تعلیم، پختہ ارادہ، ہمت اور حوصلہ کی قوتیں کافی ہیں۔ لیکن میرے پیش نظر جو رکاوٹ ہے، میرے عزیز بھائیو اور بہنو! وہ ہے روٹی کا مسئلہ معاشی مسئلہ (ECONOMIC PROBLEM) یہ ایک ایسی رکاوٹ ہے جو جذبات یا ہمت وحوصلہ سے دور ہو ہی نہیں سکتی۔ روٹی نہ ملنے پر آپ ایک دن یا دو چار دن برداشت کریں گے لیکن اس کی ایک طبعی حد ہے جس سے آگے اس کی برداشت ناممکن ہے۔ روٹی سے میری مراد انسان کی بنیادی ضروریات زندگی ہیں۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ آپ اپنا معیار زندگی اور اپنی ضروریات کو کم کریں لیکن ان کے بغیر آپ گزارہ کر ہی نہیں سکتے۔

ان مشکلات کی ابتداء زندگی کے ابتدائی حصہ ہی سے ہو جاتی ہے۔ بچپن کے زمانے کو تو خیر چھوڑ دیجئے۔ اس میں روٹی اور خیالات کے ٹکراؤ کا سوال سامنے نہیں آتا۔ اس کے بعد سوچئے کہ جب طالب علمی کے زمانہ میں آپ کے دل میں ایسے خیالات ابھرتے ہیں، جو آپ کے والد بزرگوار کے خیالات سے مختلف ہوتے ہیں تو دونوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ تو آپ دیکھئے کہ یہ خیال، کہ اگر اس ٹکراؤ نے شدت کرلی، تو میرا خرچ بند کر دیا جائے گا، کس طرح آپ کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ تعلیم کے بعد آپ ملازم ہوجاتے ہیں اور بظاہر سمجھتے ہیں کہ اب میں خود کمانے کے لائق ہوگیا ہوں اس لئے اب مجھے خیالات کی آزادی حاصل ہے۔ لیکن آپ سوچئے کہ آپ کے کتنے بلند خیالات، روشن آرزوئیں، تابندہ تمنائیں آپ کے آقائے نامدار" (BOSS) کی ایک تیوری اور اس کی نگاہ کے ایک بدلے ہوئے رخ کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اول تو ملازمت

کے حصول کے وقت ہی کتنی مصلحتیں آپ کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہیں اور اگر آپ اس خاردار وادی سے آگے بڑھ جائیں تو پھر ۲۵، ۳۰ سال تک یہ تصوّر کہ

اب چھری صیاد نے لی ، اب قفس کا در کھلا

آپ کے اعصاب پر بھوت بن کر چھایا رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کسی دن تہیہ کر کے شام کو واپس گھر لوٹیں کہ اس کشمکش کو ختم کرنا چاہیئے۔ محض چند پیسوں کی خاطر زندگی کی ہر رگ پر نوک نشتر رکھتے رکھنا کونسی زندگی ہے۔ لیکن گھر پہونچ کر بچے کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں کہ اسے اسکول میں اس لئے ڈانٹ ڈپٹ ہوئی کہ اس کی فیس ابھی تک ادا نہیں ہوئی اور بیوی کی ٹھنڈی سانس کہ بچی کو ایک سو چار درجے بخار ہے لیکن دوائی اسے آج بھی نہیں مل سکی، کیونکہ گھر میں پیسے نہیں تھے، آپ کے پختہ ارادوں کو پانی کی طرح بہا کر لے جانے کے لئے کافی ہونگے۔ یہ مجبوریاں مردوں کے لئے بھی کچھ کم جگر گداز نہیں ہوتیں لیکن ہمارے معاشرہ میں عورت کی زندگی جس طرح مسلسل کشمکش میں گذرتی ہے اس سے کون واقف نہیں۔ رشتہ ڈھونڈتے وقت اور سب کچھ دیکھا جائے گا۔ اگر کچھ نہیں دیکھا جائے گا تو وہ یہ کہ ان دونوں کے نظریات زندگی میں موافقت ہے یا نہیں۔ جب متضاد خیالات کے انسانوں کو ایک رسی میں باندھ دیا جائے تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ چند ہی دنوں میں حقیقی اور مجازی خدا میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ حقیقی خدا تو بیوی کے محض ذہن میں رہتا ہے اور مجازی خدا ایک آہنی پیکر کی شکل میں ہر وقت سامنے موجود۔ اس کشمکش میں فتح ہمیشہ مجازی خدا کی ہوتی ہے۔ کیونکہ روٹی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ سوچئے کہ ان حالات میں حق و صداقت کی آواز کو ابھرنے کے لئے کیسے موقع مل سکتا ہے۔

غریب عورتوں اور بچوں کی بیشتر بیماریوں کا تعلق تو براہ راست روٹی کے مسئلہ کے ساتھ بندھا ہوتا ہے۔ لیکن کھاتے پیتے گھرانوں کی عورتوں کا بیشتر سبب بھی یہی مسئلہ ہوتا ہے۔ آپ سوچیں گے کہ کھاتے پیتے گھرانے میں عورت کی بیماری کا سبب معاشی مسئلہ کس طرح ہے؟ وہ اس طرح کہ بدقسمتی سے بیوی اگر حساس واقع ہوئی ہے اور اسکے خیالات میاں کے خیالات سے مختلف ہیں تو وہ اگر گھر کو ہر وقت کا جہنم نہیں بنانا چاہتی۔ تو اپنے خیالات کو مسلسل دبائے رکھنے سے وہ اس جہنم کی آگ کو اپنے سینے کے اندر اتارتی رہتی ہے جس سے جسمانی ونفسیاتی بیماریاں شروع ہو جاتی ہیں اب آپ خود سوچئے کہ ان حالات میں حق کی آواز کی پرورش کے لئے کونسا آشیانہ تلاش کیا جائے؟

میں حال ہی میں اپنے تعلیمی پروگرام کی تکمیل کے بعد امریکہ سے واپس آئی ہوں۔ وہاں کا معاشی اور معاشرتی نظام بھی ہمارے نظام کی طرح غیر قرآنی ہے لیکن ان کے ہاں حالات ہم سے مختلف اور بہتر ہو گئے ہیں وہاں گھروں میں اسکولوں میں کالجوں میں اور معاشرہ کے دیگر گوشوں میں ہمارے مقابلہ میں خیالات کے ابھرنے اور باہر آنے میں زیادہ آزادی ہے اور اس آزادی کا اثر ان کی زندگی کے چہروں پر نمایاں نظر آتا ہے۔

(U.S.A) کی تمام (RESEARCH INSTITUTES) کی (DISCOVERIES) اور سائنس کی نئی نئی

ایجادیں بھی خیالات کو آزادی سے ابھرنے کے لئے مواقع فراہم کرنے کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا میں سمجھتی ہوں کہ جب تک ہمارا معاشی نظام صحیح خطوط پر متشکل نہیں ہوتا فضا حق کی آواز کے لئے زیادہ سازگار نہیں ہو سکتی۔

آپ دیکھتے ہونگے کہ طلوع اسلام کا تین چوتھائی حصہ قرآن کریم کے معاشی کے مسائل سے بھرا رہتا ہے۔ اور محترم پرویز صاحب کی تصنیفات بیشتر اسی مسئلہ کے حل سے متعلق ہیں۔ یہ اس لئے کہ صحیح زندگی کی گاڑی چلتی ہی صحیح معاشی نظام پر ہے۔ اسی سے قرآن پاک کی عظمت میرے سامنے آئی۔ ہم نے مذاہب کی دنیا میں سنا ہے کہ روٹی کا مسئلہ دنیاداروں کا مسئلہ ہے۔ اور مذہب کا تعلق انسان کی آخرت کی نجات سے ہے، لیکن یہ قرآن پاک ہے جس نے بتایا کہ جو قوم خدا کے قوانین سے غافل ہو جاتی ہیں اس پر معاشی تنگی آجاتی ہے۔ اور جو خدا کے قوانین کے مطابق چلتی ہے۔ اس پر معاشی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

طلوع اسلام نے قرآن کے اسی پیغام کو عام کیا ہے جس کا مطلب ہے کہ اس نے اس بنیادی مسئلہ کو سامنے رکھا ہے جو حق کی آواز میں پہاڑ بن کر حائل ہے۔ اور اس سے مجھے یقین ہے۔ یہ آواز اپنا اثر پیدا کر کے رہے گی اس لئے کہ حق کی آواز کبھی صدا بصحرا ثابت نہیں ہو سکتی۔ والسلام

محترمہ مسز شمیم انور
انگریزی تقریر کا اردو ترجمہ

(۶)

احتسابِ خویش

خواتین و حضرات!

آپ نے ان موانعات کی تفصیل سن لی جو طلوع اسلام کی آواز کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہیں۔ لیکن یہ حقیقت در خورِ مبارکباد ہے کہ ایسے حوصلہ شکن اور ناسازگار حالات کے باوجود ہمارا قدم پیچھے نہیں ہٹا، آگے ہی بڑھا ہے۔ طلوع اسلام کی آواز نے نہ صرف پاکستان بلکہ بیرونِ ملک کی فضا میں بھی ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔ خیالات کی قوت بھی کس قدر شدید ہوتی ہے؟

لیکن جو کچھ میں کہنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ بہت سے پتھروں کو راستے سے ہٹانا ہے۔ لیکن ان موانعات کا تصور کہیں ہماری تنقیدی نگاہ کو صرف اُن خارجی موانعات کی طرف منتقل نہ کردے

جو مختلف وجوہات کی بنا پر گھلے بندوں ہماری راہ روکے کھڑے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ یہ نہایت ضروری ہے کہ جو کچھ ہمارے گرد و پیش ہو رہا ہے ہم اس سے ہر وقت باخبر رہیں اور اس پر پوری پوری نگاہ رکھیں لیکن اس سے کہیں یہ حقیقت نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے کہ ان خارجی موانعات سے کہیں زیادہ ضرورت محاسبۂ خویش کی ہے۔

ہم اب تک بیرونی مخالفتوں ہی کا جائزہ لیتے رہے ہیں اور خود اپنے اندر بہت کم جھانک کر دیکھا ہے حالانکہ احتساب خویش کی طرف سے غفلت' ہر تحریک کے لئے خطرناک ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ خود ہمارے اندر کتنی کمیاں ہیں ——— کہیں ایسا تو نہیں کہ طلوع اسلام کی تحریک کے راستے میں ہم خود ہی سب سے بڑے سنگِ گراں ہیں ؟

لیکن مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ تجزیۂ خویش اور محاسبۂ نفس بڑا مشکل اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ دوسروں کے نقائص و اسقام کا سراغ تو بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے لیکن اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی آپ نشاندہی کرنا اب آسان نہیں ہوتا' بالخصوص ایسی قوم کے لئے جو مدتوں سے تنقیدِ خویش کی خوگر نہ رہی ہو۔ ہماری تباہی کا سب سے بڑا بلکہ بنیادی سبب یہی ہے تنقیدِ خویش کی طرف سے چشم پوشی کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو بڑا مقدس اور پارسا سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اور یہ خود فریبی' انسان کی اُس متاعِ گراں بہا کی رہزن بن جاتی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ ذرا سوچئے' اور سوچئے' خواتین و حضرات ! کہ کیا ہم اس فریب نفس میں مبتلا تو نہیں کہ کمزوریاں سب دوسروں میں ہیں۔ ہم نہایت مقدس و مکمل انسان ہیں ؟ آیئے ہم فرصت کے ان چند لمحات میں اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور دیکھیں کہ جس چور کو ہم تنقیدِ غیر کے چراغوں کی روشنی میں باہر کی دنیا میں تلاش کر رہے ہیں وہ کہیں خود ہماری اپنی من کی دنیا ہی میں تو چھپا نہیں بیٹھا ! میں آپ کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ ہماری یہ تلاش و جستجو ہمارے حق میں بڑی نفع بخش ثابت ہوگی۔ دنیا میں جتنی قومیں صحت و توانائی کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں' وہ مسلسل اور مستقل طور پر اپنا امتحان خود کرتی رہتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً جائزہ خویش' اس قوم کو زندگی کا ایک نیا وثیقہ عطا کر دیتا ہے' اس لئے کہ اس سے اُس قوم کا ہر فرد اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے کہ جس نصب العین کو اس نے اپنی زندگی کا منتہیٰ قرار دے رکھا ہے' وہ اس سے کسقدر فاصلے پر کھڑا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے اسے ابھی کیا کچھ کرنا ہے۔ جس طرح ایک دکاندار اپنے سالانہ حساب کتاب سے یہ معلوم کر لیتا ہے کہ اس کا کاروبار نفع کی طرف جا رہا ہے یا نقصان کی طرف' اسی طرح قوم اپنے جائزہ سے یہ دیکھ لیتی ہے کہ اس کا قدم ترقی کی طرف اُٹھ رہا ہے یا تنزل کی طرف۔ یاد رکھئے! اسی احتساب خویش میں ہماری صحت' توانائی اور زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ میرا خیال ہی نہیں یقین ہے۔ کہ ہماری تحریک کے راستے میں سب سے بڑا سنگِ راہ یہی ہے کہ ہم نے کبھی رُک کر احتسابِ خویش نہیں کیا۔ اپنا جائزہ نہیں لیا۔

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ طلوع اسلام کی تحریک کے ساتھ وابستگی کے بعد ہمارے اپنے اندر۔

ہمارے قلب و نگاہ میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی ہے یا نہیں، "تبدیلی" سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ غلط تصورات، نظریات اور معتقدات جنہیں ہم نے اپنے ماں باپ اور اسلاف سے وراثت میں لیا تھا یا جو سوسائٹی کے اثرات سے ہمارے اندر جذب ہو چکے تھے انہیں ہم کس حد تک چھوڑ چکے ہیں۔ یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب ہوتا ہے۔ اس کے لئے، مقصد کے ساتھ دیانتدارانہ وفاشعاری اور ذہنی ضبط خویش کی ضرورت بنیادی ہے۔ یہ پرکھنے کے لئے کہ ہمارے قلب و نگاہ میں کس حد تک تبدیلی ہوئی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ جو واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے اس کے خلاف ہمارا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ اگر وہ ردعمل قرآنی اقدار و تصورات کے مطابق ہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے اندر صحیح تبدیلی پیدا ہونی شروع ہو چکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے کبھی اپنے آپ کو اس کسوٹی پر کس کر دیکھا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک زندہ انسان کا ہر لمحہ ایک امتحان ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ کیا زندگی کے ان لمحات میں ہمارا ردعمل وہی ہوتا ہے جو قرآن کا تقاضا ہے۔ یہ سوال ہمیں پیہم اور متواتر اپنے آپ سے کرتے رہنا چاہیئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قوموں کی موت اور زندگی کا مدار مادی قوت پر اتنا نہیں ہوتا جتنا اس نظریۂ زندگی پر ہوتا ہے جسے انہوں نے اپنے سامنے بطور فلسفۂ حیات رکھا ہو۔ اسی فلسفۂ حیات سے ان کی نگاہ کا زاویہ بدلتا ہے۔ قرآن کی حقیقی عظمت اس میں ہے کہ وہ نگاہ کا زاویہ بدل دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہماری نگاہوں کا زاویہ اس طرح بدل چکا ہے؟ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ ہم نے طلوع اسلام کی تحریک کو بھی ایک عام "پارٹی سیاست" سمجھ رکھا ہے۔ "پارٹی سیاست" سے میرا مطلب یہ ہے کہ جب ہم اس کی رکنیت کے فارم پر دستخط اور اس کے بعد چند پیسے بطور چندہ ادا کر دیتے ہیں یا جب کوئی ریزولیشن سامنے آئے تو اس کی تائید میں ہاتھ اٹھا دیتے ہیں، تو اس سے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اس تحریک کا تقاضا پورا کر دیا۔ خواتین و حضرات! یہ بالکل غلط ہے طلوع اسلام کی تحریک اس سے یکسر مختلف ہے۔ اس کی اہمیت اس سے کہیں گہری اور اس کے تقاضے اس سے کہیں وسیع ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے پیش کردہ نصب العین کی صداقت کا یقین ہمارے دل کی گہرائیوں سے ابھرنا چاہیئے۔ یہ زبان سے اقرار یا قلم خود دستخط کر دینے کا نام نہیں۔ قرآن کی تعلیم اس باب میں بالکل واضح ہے۔ بعض عرب قبائل فتح مکہ کے بعد، مسلمانوں کی شوکت و ثروت سے مرعوب ہو کر اسلام لے آئے اور اپنے آپ کو مومن کہلانا شروع کر دیا۔ قرآن نے انہیں فوراً ٹوکا اور کہا کہ تم اپنے آپ کو مومن مت کہو۔ یہ کہو کہ ہم نے مسلمانوں کی قوت و شوکت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ ابھی ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں کے اندر داخل نہیں ہوا۔ (۴۹/۱۴)۔ لہٰذا، خواتین و حضرات! جب ہم کنونشن کے ان اجتماعات کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس جائیں تو ہمیں اپنے دلوں کو ٹٹولنا چاہیئے کہ اس تحریک کے نصب العین کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت یقین ان کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکا ہے یا ہمارا اس تحریک سے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے کہ ہم اس کی تائید میں ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔ یہ تحریک ہاتھوں کی گنتی کے سہارے نہیں، دلوں کی قوت کے بل پر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے والی تحریک ہے۔

پھر ہم میں کتنے ہی ایسے ہیں جنہیں ہمیشہ یہ شکوہ رہتا ہے کہ طلوع اسلام ہمیں کوئی عملی پروگرام نہیں دیتا۔ یہ شکوہ،

ہم میں سے بعض کے تو صرف حلق تک آکر رہ جاتا ہے لیکن اکثر وہ بھی ہیں جو اسے زبان تک بھی لے آتے اور اس کا عام چرچا کرتے ہیں یعنی کہتے ہیں کہ ہم نے بہت کچھ سن لیا ہے۔ اب ہمیں کچھ عملی کام پروگرام بھی دینا چاہیئے۔ بظاہر یہ الفاظ بڑے معقول اور یہ مطالبہ بڑا بلند نظر آتا ہے۔ لیکن اگر ہم احتساب خویش کریں گے تو یہ آوازیں ایسی خوش آئند نہیں رہیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سامنے "عملی پروگرام" کا تصور وہی ہے جسے ہم نے انگریزی حکومت کے زمانے میں سیکھا تھا۔ ہمارے دل میں یہ خیال گھر کر چکا ہے کہ ہم نے نعروں اور جلوسوں۔ تقریروں اور سلوگنوں۔ جھنڈیوں اور پرچموں۔ غوغا آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں سے انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کیا تھا۔ اس لئے عملی پروگرام یہی ہے۔ اس کے سوا اور عملی پروگرام کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے ہم اسی قسم کے عملی پروگرام کا طلوع اسلام سے مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے یہ ہیں کہ چونکہ ہمارے سامنے اس قسم کا عملی پروگرام نہیں اس لئے ہماری رفتار بہت سست ہے۔ یہ ہماری بنیادی غلطی ہے۔ انسان کے سامنے اس سے بڑا پروگرام اور کوئی ہو نہیں سکتا کہ وہ پہلے اپنے اندر ایک صحیح انقلاب پیدا کرے اور اس کے بعد دوسروں کے قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ قلب و دماغ کے صحیح انقلاب کے بغیر قوموں میں کبھی انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا۔ طلوع اسلام کا یہی پیغام ہے۔ یہی پروگرام ہے۔ اور اسی کی تکمیل کی وہ ہم سے توقع رکھتا ہے مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اس پروگرام کے نتائج سردست بڑے غیر مرئی اور غیر محسوس سے ہیں اور ہمیں صرف مرئی اور محسوس نتائج ہی مطمئن کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم فنڈ جمع کر کے ایک عمارت کھڑی کر دیتے ہیں۔ وہ محسوس شکل میں ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اور اس سے ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے ایک عملی کام کیا ہے لیکن قرآن اسے انسان کی عجلت پسندی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اینٹوں اور پتھروں کی عمارتیں بنا دینا آسان ہے اور یہ انسان کی طبع عجلت پسند کی تسکین کا سامان بہم پہنچا دیتی ہیں۔ لیکن دلوں کی بستیاں بسانا بڑا مشکل کام ہے اور اس کے لئے بڑے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے جو شخص طلوع اسلام کی تحریک سے وابستہ ہونے کے لئے آگے بڑھے اسے پہلے دن سے اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیئے کہ یہ غوغا آرائیوں اور ہنگامہ خیزیوں کی تحریک نہیں۔ یہ نہایت خاموشی سے فکر و نظر کا ایک جہان نو تعمیر کرنے کی تحریک ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خشت

اس کے لئے ہمیں اس حقیقت پر محکم یقین رکھنا چاہیئے کہ حق کی آواز خواہ اس کے محسوس نتائج ہمارے سامنے نہ ہی آئیں، کبھی صدا بصحرا ثابت نہیں ہوتی۔ وہ اپنا اثر مرتب کر رہی ہوتی ہے۔ نظریات کی قوت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا زیادہ ہوتی ہے۔ انسانی کوششوں کے جو نتائج محسوس طور پر سامنے آتے ہیں وہ درحقیقت انسان کی داخلی دنیا کی تبدیلیوں ہی کے پیکر ہوتے ہیں۔ دلوں میں اس قسم کی تبدیلیاں پیدا کرنا درحقیقت سب سے بڑا عملی پروگرام ہے۔ قوم کو طلوع اسلام کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ اس نے اسے جذبات کی ہنگامہ خیزیوں سے نکال کر صحیح فکری اور قلبی

تبدیلیوں کا خاموش پروگرام دیا ہے۔ کیا ہم اس کا دعوے کر سکتے ہیں کہ ہم نے طلوع اسلام کے پیش کردہ اس پروگرام کو تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ ایسی تبدیلی پیدا کرنا تو ایک طرف، کیا ہم نے اس کے پیغام کو اس حد تک عام کر دیا ہے کہ اس کی آواز پر پاکستان کی آبادی کی اکثریت لبیک کہنے کے لئے اٹھ کھڑی ہو؟ کیا ہم نے ایسا کر لیا ہے! اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اس کا جواب دیجئے۔ پھر کیا خود ہم میں ایسی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے کہ ہم قرآنی اقدار کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہوں۔ لهذا قبل اس کے کہ ہم طلوع اسلام سے اس کے پروگرام کی اگلی عملی کڑی کا مطالبہ کریں، ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ان سوالات کے ہمارے پاس کیا جواب ہیں! قرآن کے نزدیک مومن ہونے کا تو معیار ہی یہ ہے کہ وہ حق و صداقت کی خاطر اپنا جان۔ مال۔ گھربار۔ سب کچھ چھوڑ دیتے ہیں۔ جب معیار یہ ہے تو ذرا پوچھئے اپنے آپ سے کہ ہم اس معیار پر پورے اترتے ہیں! قرآن تو یہ کہتا ہے کہ اگر تمہارے ماں باپ یا اولاد۔ تمہارے بہن بھائی یا دیگر رشتہ دار۔ تمہارے بیوی بچے۔ تمہارا مال و دولت۔ تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم اس قدر خائف ہوتے ہو۔ تمہارے محلات جنہیں تم اتنی پسند خاطر سے بولتے ہو۔ ان میں سے اگر کوئی چیز بھی تمہارے نزدیک اللہ اور رسول کے راستے میں جہاد سے زیادہ عزیز ہو گئی۔ تو پھر انتظار کرو تا آنکہ خدا کا آخری فیصلہ تمہارے متعلق آ پہنچے ($\frac{9}{24}$) سوچئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو قرآن کے اس معیار پر پورے اترتے ہیں؟ اگر ہم اس پر پورے نہیں اترتے تو پھر ہمیں اس کا کوئی حق نہیں کہ ہم طلوع اسلام سے کسی مزید عملی پروگرام کا مطالبہ کریں۔

اس مقام پر مجھے یاد آگیا کہ سال گذشتہ ہم نے کنونشن ہی کے اندر اس بات کا فیصلہ کیا تھا کہ ہم اپنی نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک کالج تعمیر کریں گے۔ کیا میں دریافت کرنے کی جرأت کر سکتی ہوں کہ ہم نے اس سلسلہ میں اس سال بھر میں کیا کیا ہے؟ کم از کم مجھے تو اس کے ابھی تک کوئی آثار دکھائی نہیں دیئے۔ فرمائیے کہ کیا یہ عملی پروگرام نہیں تھا؟ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کے نزدیک یہ بھی عملی پروگرام نہیں تھا۔ ہم عملی پروگرام اس کو سمجھتے ہیں۔ جس میں نعرے اور جلوس ہوں۔ جھنڈیاں اور پرچم ہوں — یعنی وہ عملی پروگرام جس کا کچھ نظارہ ہم نے ابھی ابھی انتخابات کے سلسلہ میں دیکھا ہے — چند دنوں کی غوغا آرائی اور پھر موت کا سکوت! یہ ہے ہمارے نزدیک عملی پروگرام سے مفہوم —

خواتین و حضرات! بدقسمتی سے ہم پیدا ہی اس قوم میں ہوئے ہیں جس کا ماضی جذبات پرستی کی روایات پر مشتمل ہے۔ قرن اول کے بعد ہماری تاریخ اس کے سوا کیا ہے کہ ایک سرسام زدہ سے دماغ کی چند حرکات مذبوحی اور اس کے بعد کامل عشق کا سکوت۔ خالص جذباتیت انسان کے تمام قوائے عملیہ کو پھونک ڈالتی ہے اور اس کے بعد راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ خود ہمارا پاکستان اسی قسم کی ایک (ASH-TRAY) ہے جس میں ہماری سترہ سالہ جذباتی شعلہ پرستی کی راکھ جمع ہے۔ یہی راکھ ہماری ہنگامہ آرائیوں کی ماحصل ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے

طلوع اسلام کی تحریک سے وابستگی کے بعد اس سے مختلف کچھ اور کام کیا ہے؛ حقیقت یہ ہے کہ ہم محنت سے جی چراتے ہیں، مشقت سے گھبراتے ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ہنگامہ برپا کرکے ایک دن میں اپنا خون تک بہا دیتے ہیں لیکن اگر ہم سے کہا جائے کہ دس دن تک کسی کو جلا کر پانی پلا دیا جائے تو اس کی ہم اپنے میں ہمت نہیں پاتے۔ قرآنی پروگرام کی اصل و بنیاد استقامت ہے اور اسی جوہر کی ہم میں کمی ہے۔

اس کے علاوہ ہم ایک اور جرم کے بھی مرتکب ہوتے ہیں جو دیگر جرائم سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم میں اخلاقی جرأت نہیں۔ ہم میں سے اکثر وہ ہیں جو طلوع اسلام کی دعوت اور تحریک کے دل سے قائل ہیں لیکن اسے زبان پر لاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہم اپنے گھر کے اندر، تنہائیوں میں، گفتگو کرتے ہوئے طلوع اسلام کے پیغام کی پوری پوری تائید و توصیف کرتے ہیں لیکن اگر ہم سے کہا جائے کہ یہی بات گھر سے باہر نکل کر آواز بلند کہئے تو ہمیں سانپ سونگھ جاتا ہے۔ ہم گھبراتے ہیں، ہچکچاتے ہیں، ڈرتے ہیں کہ ایسا کہنے سے کہیں ہم پر بھی کفر کا فتویٰ نہ لگ جائے۔ کسقدر قابلِ تاسف ہے ہمارا یہ طرزِ عمل! طلوع اسلام کی تحریک کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری یہ اخلاقی کمزوری ہے۔ میں سر دست اس سوال کو چھیڑنا نہیں چاہتی کہ ہم میں سے کسی کو اس کا حق بھی حاصل ہے یا نہیں کہ دوسروں کو کافر کہے۔ میں اسوقت صرف اسقدر کہنا چاہتی ہوں کہ اگر طلوع اسلام کی قرآنی دعوت سے وابستگی کا نام "کفر" ہے تو ہمیں اس کفر پر ناز کرنا چاہیئے۔ یاد رکھئے! طلوع کی حق و صداقت پر مبنی آواز، کفر کے فتووں سے کبھی دب نہیں سکتی۔ یہ آواز اپنے زور دروں سے آگے بڑھے گی اور اوپر اٹھے گی۔ ہمارے سامنے سرسید، اقبال اور قائد اعظم کی مثالیں موجود ہیں۔ اپنے اپنے وقت میں انہیں کافر کہا گیا لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ ان کی جلائی ہوئی شمعیں آج افق پاکستان پر سورج کی طرح جگمگا رہی ہیں اور جنہوں نے ان پر کفر کے فتوے لگائے تھے کسی کو آج ان کا نام تک بھی یاد نہیں۔ لہٰذا خواتین و حضرات! ان کفر کے فتووں سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہم اپنی اس کمزوری سے پہلے ہی تحریک طلوع اسلام کو کافی نقصان پہنچا چکے ہیں۔ آیئے! ہم اس کنونشن میں اس بات کا تہیہ کریں کہ ہم نے جس تحریک کے ساتھ اپنا دامن باندھا ہے، ہم اس کا چرچا کھلے بندوں کریں گے۔ ہر ایک سے کریں گے۔ ہر حال میں کریں گے اور نتائج و عواقب کی پرواہ کئے بغیر کریں گے۔ یہ اس لئے کریں گے کہ ہمیں اس تحریک کے ساتھ وابستہ دامن ہونے پر فخر ہے۔ طلوع اسلام سے نسبت ہمارے لئے وجۂ عزت ہے۔

میں نے شروع میں کہا ہے کہ احتساب خویش کا فریضہ بڑا ہمت طلب ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہے کہ اس کے بغیر کوئی تحریک آگے چل نہیں سکتی۔ لہٰذا ہمیں اپنا تجزیہ کرنا ہوگا۔ اور بہر گوشے سے کرنا ہوگا۔ مجھ سے پہلے ایک مقرر نے کہا ہے کہ ہمارا زمانہ "دورِ معیشت" ہے جس میں انسان کو محض زندہ رہنے کے لئے بڑی محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اس کے لئے قدم قدم پر دوسروں کے ساتھ مقابلہ کا سوال سامنے آتا ہے اس سے ہم میں ایک خاص ذہنیت پیدا ہوگئی ہے۔ یعنی زندگی کے ہر معاملہ میں "کاروباری ذہنیت" آج سے

کچھ عرصہ پہلے اس ذہنیت کو بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا نام ہی "بنیا ذہنیت" تھا۔ لیکن اب وہی "بنیا ذہنیت" معاشرہ کا معمول بن چکی ہے۔ اس سے پہلے بنیوں کا ایک الگ طبقہ ہوتا تھا۔ اب ہم میں سے ہر ایک بنیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس بات کا تصور ہی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص مفادِ خویش کے جذبہ سے بلند ہو کر بھی کچھ کر سکتا ہے۔ یہ بات ہمارے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ کوئی شخص اپنا آرام۔ چین چھوڑ کر دوسروں کے سکھ کی خاطر دکھ جھیل سکتا ہے۔ اگر اس قسم کے کسی شخص کا ذکر ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم اسے احمق قرار دیتے ہیں۔ اسے پاگل سمجھتے ہیں۔ ہم باور ہی نہیں کر سکتے کہ کوئی صاحبِ عقل و ہوش اپنے مفاد کا خیال چھوڑ کر دوسروں کے مفاد کی فکر کر سکتا ہے۔ اور چونکہ ہمارے نزدیک عقل و ہوش کا تقاضا ہی مفادِ خویش کا تحفظ ہے اس لئے ہم شعوری اور غیر شعوری طور پر ہر وقت مفادِ خویش کے حصول و تحفظ کی دُھن میں جذب رہتے ہیں ــــ معاشی مفاد، سیاسی مفاد، معاشرتی مفاد ــــ ہم مفادِ خویش کے جذبہ میں سرمست رہتے ہیں اور دوسروں کے متعلق بھی یہی خیال کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کا جذبہ محرکہ بھی مفادِ خویش ہی ہے ــــ میں اس بارے میں حَکَم نہیں بننا چاہتی۔ ہم میں سے کسی کو بھی حق حاصل نہیں کہ دوسروں کی ذہنیت سے متعلق فیصلے صادر کرے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آئیے! ہم اپنے اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھیں اور سوچیں کہ ہم نے اس جذبہ کی پرورش سے (کہ نہ ہم خود مفادِ خویش سے بلند ہو کر کچھ کریں اور نہ ہی دوسروں کے متعلق یہ خیال کریں کہ وہ مفادِ خویش کے جذبہ سے بلند ہو کر کچھ کرتے ہیں) تحریک طلوعِ اسلام کو کسقدر نقصان پہنچا چکے ہیں اور پہنچا رہے ہیں۔ اس طرح اپنا اپنا جائزہ لینے کے بعد آیئے ہم تہیہ کریں کہ ہم اس "کاروباری ذہنیت" کو الگ جھٹک کر، مقصد اور صرف مقصد کے فروغ اور کامیابی کے لئے امکان بھر کوشش کرنے کے جذبات اپنے اندر بیدار کریں اور اس طرح اپنے خیالات و تصورات کی عروقِ مُردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیں۔ یہی خونِ زندگی تحریک طلوعِ اسلام کی صحت اور توانائی کا موجب بنے گا۔

برادرانِ عزیز! اب میں ایک ایسے گوشے کی طرف آنا چاہتی ہوں جو ہماری تحریک کی متاعِ گراں بہا پر شبخون مارنے والوں کے لئے کمین گاہ بنتا ہے۔ اور وہ ہے حسد کا جذبہ۔ جب ہم کسی دوسرے شخص کو وہ کچھ حاصل کرتا دیکھتے ہیں جو کچھ ہم حاصل نہیں کر سکے تو حسد کا جذبہ ہمارے ایغو کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے اور ہمارے دل و دماغ پر بُری طرح چھا جاتا ہے۔ اگر یہ فردِ مقابل کوئی مافوق الفطرت ہستی ہو تو ہم اس کا احترام کرنے لگ جاتے ہیں لیکن اگر وہ شخص بدقسمتی سے ہمارے جیسا ہی انسان ہو تو ہمارے سینے میں اس احساس کی آگ بھڑک اٹھتی ہے کہ یہ شخص اسقدر منفرد مقام پر فائز کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ایک انسان ہے اور ہم بھی انسان ہیں۔ پھر اسے کیا حق حاصل ہے کہ یہ ہم سے زیادہ عزت کا مستحق سمجھا جائے؟

یہ ٹھیک ہے کہ وہ بھی ایک انسان ہے اور ہم بھی انسان ہیں۔ لیکن ہم دونوں میں جو فرق ہے ہم اس کی طرف سے آنکھ بند کر لیتے ہیں۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ جب یہ راتوں کو جاگتا تھا، ہم گہری نیند سوتے تھے۔ جب یہ دن بھر محنت و مشقت سے کام کرتا تھا، ہم افیون کھا کر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ جب یہ دکھ جھیل رہا تھا، ہم بیگانہ وار اس کے پاس سے

گذر جاتے تھے۔ جب یہ تخلیقی فکر میں لہو پانی ایک کر رہا تھا ہم گپیں ہانکتے میں اپنا وقت ضائع کر رہے تھے۔ جب یہ مطالعہ میں جذب ہوتا تھا، ہم خیالی پلاؤ پکانے میں مصروف ہوتے تھے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے کیا یہ حقیقت نہیں! پھر ہم میں سے کتنے ہیں جو اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے لئے تیار ہیں! آیئے ہم اس تلخ حقیقت کا اعتراف کریں کہ ہم میں فطرت نے جو صلاحیتیں رکھی تھیں ہم نے نہ ان کی مناسب نشوونما کی۔ نہ ان سے فائدہ اٹھایا۔ ہم نے اس امانت میں خیانت کی جسے مبداءِ فیض نے ہمارے سپرد کیا تھا۔ ہم نے ان عطیات کی قدر شناسی نہ کی جو ہمیں انسان ہونے کی حیثیت سے مفت ملے تھے۔ ہم نے ایسا نہیں کیا۔ لیکن جس نے ایسا کیا ہے جس نے ان عطیاتِ فطرت سے صحیح صحیح فائدہ اٹھایا ہے وہ اس عزت کے مقام کا مستحق ہے۔ جو اس کی محنت و مشقت اور سعی و کاوش کا فطری نتیجہ ہے۔ لہذا ہم اس سے حسد کرنے کی بجائے اس پر رشک کیوں نہ کریں۔ ہم بھی اس جیسا بننے کی کوشش کیوں نہ کریں۔ ہمیں اس جیسے بیشمار انسانوں کی ضرورت ہے۔ آؤ! ہم آج سے تہیہ کریں کہ ہم اس پر حسد کرکے اپنا خون کھولانے کی بجائے محنت کرکے اس کمی کو پورا کریں گے۔

اب خواتین و حضرات! ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم قرآنی تصوراتِ حیات پر ایمان رکھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اور جہاں ان تصورات اور ہمارے اپنے ذہن کے تصورات، خواہشات اور مفاد میں تصادم ہو، ہم قرآنی تصورات کو ہر حالت میں غالب رکھیں گے۔ لیکن ہماری حالت کیا ہے؟ ہم طلوع اسلام کے پیش کردہ قرآنی تصورات کے ساتھ صرف اس حد تک جاتے ہیں جس حد تک وہ ہمارے اپنے تصورات اور خواہشات کا ساتھ دیتا ہے۔ جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی طرف سے پیش کردہ کوئی تصور، ہمارے کسی تصور کے خلاف جاتا ہے، ہم طلوع اسلام کے خلاف گلہ طرازی اور شکوہ سنج ہوجاتے ہیں۔ میں پوچھنا یہ چاہتی ہوں کہ کیا دیانتداری کا یہی تقاضا ہے؟ اگر قرآن کا فریضہ یہی تھا کہ وہ ہمارے مفاد، مفاد، خواہشات اور تصورات کی تائید کرتا چلا جائے۔ تو ہمیں قرآن کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس قسم کی وحی کی راہ نمائی کے لئے وجۂ جواز ہی کیا تھی! اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا! میں اس سلسلہ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گی۔ قرآن نے ان تمام دیوتاؤں کو پاش پاش کر دیا جنہیں مردوں نے عورت کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنائے رکھنے کے لئے پوری چابکدستی سے تراشا تھا۔ اس باب میں قرآن کی تعلیم واضح ہے۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں عورت اور مرد کو دوش بدوش چلتے دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن ہم میں سے اکثر مردوں پر یہ حقیقت بڑی ناگوار گذرتی ہے اس سے ان کے تنگ و تاریک قلب میں بڑا اضطراب پیدا ہوجاتا ہے۔ ان کی یہ تنگ نظری خود ان کی انتہائی بدقسمتی ہے۔ بدقسمتی اس لئے کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ اس سے وہ فطرت کی کتنی بڑی گراں بہا متاع سے محروم رہ جاتے ہیں — میں اس قسم کے محروم و بدنصیب انسانوں سے واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتی ہوں کہ طلوع اسلام

کی تحریک انسانی مساوات کی بنیادوں پر استوار ہے اور جو اسے کامیاب دیکھنا چاہتا ہے، اسے انسانی مساوات کے تصور کو اپنا خضرِ راہ بنانا ہوگا ـــــ یاد رکھئے! اگر آپ نے عورتوں کو وہ مقام نہ دیا جو مقام انہیں خدا نے عطا کیا ہے۔ اگر آپ نے انہیں قرآنی اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے نمود ذات کے مواقع سے محروم رکھا ــــ تو وہ دن دور نہیں جب عورتیں ان غیر قرآنی زنجیروں کو توڑ ڈالیں گی جن میں آپ نے انہیں بری طرح جکڑ رکھا ہے ــــ اور جس جذبۂ انتقام سے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہونگی اس کی تلاطم خیزیوں کی تاب لانا آپ کے بس کی بات نہیں ہوگی۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے پچھلے سال "قوم کی نئی نسل کی تخریبی ذہنیت کی طرف بھی اشارہ کیا تھا اور بتایا تھا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان غیر فطری، غیر قرآنی قیود سے تنگ آچکے ہیں جو مذہب اور سوسائٹی کے نام سے قدم قدم پر ان پر عائد کی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان حدود و قیود کو توڑ ڈالنا چاہتے ہیں ـ یہ وہ منزل ہے جسے قرآن لا الٰہ سے تعبیر کرتا ہے۔ انہیں یہ منزل بڑی پسند آتی ہے ـ وہ اس تخریب میں بڑی لذت محسوس کرتے ہیں۔ اس سے اگلی منزل الا اللہ کی ہے ـ یعنی تخریب کے بعد تعمیر۔ نفی کے بعد اثبات۔ چونکہ تعمیر کے لئے بڑی محنت اور مشقت درکار ہوتی ہے ـــ اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، ہم بدقسمتی سے "من حیث القوم محنت کے عادی نہیں رہے۔ اس لئے ہمارے یہ نوجوان اس منزل کی طرف آنے سے گھبراتے ہیں اور اپنی تمام توانائیاں تخریب میں صرف کرکے مطمئن ہوجاتے ہیں کہ ہم بہت بڑا انقلابی کام کر رہے ہیں۔ انہیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جس تخریب کے بعد تعمیر نہیں، اس سے زندگی میں ایسا خلا پیدا ہوجاتا ہے۔ جو کسی اور طرح پُر نہیں ہوسکتا اس لئے ایسے افراد کی ساری زندگی عدمِ اطمینان اور فقدانِ سکون کی زندگی ہوتی ہے

لیکن ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کی تخریبی ذہنیت کا سبب محض سہل انگاری نہیں ہوتی۔ اس کے نفسیاتی اسباب اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو طلوعِ اسلام کی تحریک سے وابستگی بڑے نقصان رساں نتائج کا موجب ہوتی ہے۔ ان سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے

آخر میں مجھے ایک اور اہم نقطہ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا ہے۔ ہم بعض اوقات قرآنی تصورات کو نہایت دیانتداری سے غلط طور پر سمجھتے اور لوگوں کو سمجھاتے ہیں۔ اگر ہم نے کسی بات کو غلط سمجھا ہو لیکن اسے اپنے تک ہی محدود رکھیں، تو یہ چیز اتنی زیادہ خطرناک نہیں ہوتی جتنی یہ بات کہ ہم اس غلط مفہوم کو اوروں تک پہنچاتے چلے جائیں ــــ بات منہ سے نکل کر آتش جنگل کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہے۔ کسی تصور کے غلط مفہوم کی تبلیغ بہرحال نقصان رساں

ہوتی ہے، لیکن جب یہ غلط مفہوم کسی ایسے شخص کی زبان سے آگے پہنچے جو تحریک طلوع اسلام سے وابستگی کا مدعی ہے، تو اس کی نقصان رسانی کی شدت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ غلط بات تو وہ شخص کہتا ہے اور اس کی ساری ذمہ داری طلوع اسلام پر عائد ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اس باب میں بڑی ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہمیں کوئی ایسی بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیئے جس کے متعلق ہمیں کامل یقین نہ ہو کہ وہ طلوع اسلام کے پیش کردہ پیغام کے عین مطابق ہے۔ اگر آپ کو اس کا پورا پورا یقین نہیں تو ایسے موقعہ پر آپ کی خاموشی آپ کی لب کشائی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریکوں کو دانا دشمنوں کے ہاتھوں کبھی اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا نادان دوستوں کے ہاتھ سے پہنچتا ہے۔ "نادان دوست" سے مراد ایسے افراد ہیں جو نہایت دیانتداری سے "نادانستہ" وہ باتیں کہہ جاتے ہیں جو اس تحریک کے پیغام و دعوت کی صحیح ترجمانی نہیں کرتیں۔ اس حقیقت کو گیوانی پاپینی نے اپنی تصنیف "حیات مسیح" میں بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

> جب تقدیر کسی عظیم انسان کو اس کی عظمت کی سزا دینا چاہتی ہے تو اس کے لئے اس کے پاس، اس سے زیادہ مؤثر حربہ کوئی اور نہیں ہوتا کہ وہ اس کے عقیدتمندوں کا حلقہ پیدا کر دیتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہر شخص محض اس بنا پر کہ وہ اس عظیم شخصیت کا عقیدتمند ہے، ضروری نہیں کہ اس کی ہر بات کو کماحقہ سمجھ بھی سکے۔ اگر وہ اس کا پچاس فیصد بھی صحیح طور پر سمجھ لے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیئے ۔۔۔ اور یہ بھی اس کی ذہنی صلاحیت کی نسبت سے ہوتا ہے۔ (جب وہ اس طرح ناقص سمجھی ہوئی بات کو آگے پہنچاتا ہے تو) تو اس نیت کے بغیر کہ وہ اپنے راہ نما کے پیغام کی تکذیب کرے، وہ اسے بری طرح سے مسخ کر دیتا ہے۔ اسے پست سطح پر لے آتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کم کر دیتا ہے۔ اسے کچھ کا کچھ بنا کر رکھ دیتا ہے۔

مجھے، خواتین و حضرات! جو کچھ کہنا تھا وہ میں کہہ چکی ہوں۔ اس وقت میرے ذہن میں اپنے مرض کی یہی علامات آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں ان کے علاوہ کئی اور بھی ہوں۔ اگر ہم وقتاً فوقتاً اس طرح محاسبہ خویش کرتے رہیں تو اپنے مرض کی علامات اور اس کے اسباب و علل ایک ایک کر کے ہمارے سامنے آتے رہیں گے لیکن میں پھر اس نکتہ پر زور دوں گی کہ ہمیں انفرادی طور پر اپنا محاسبہ ہر وقت کرتے رہنا چاہیئے۔ مرض کی بروقت تشخیص، علاج میں سہولت پیدا کرتی ہے اور صحت کی بازیابی میں بھی زیادہ وقت نہیں لگتا۔ یہ ہماری حرماں نصیبی ہو گی کہ ہم حق و صداقت کی صحیح راہ پا لینے کے بعد محض اس لئے بیگانۂ منزل ہو جائیں کہ ہم نے راستے میں

کھڑے ہو کر کبھی سوچا نہیں تھا کہ کسی دوراہے پر ہمارا قدم غلط سمت کی طرف تو نہیں اٹھ گیا۔ یاد رکھئے! تحریکیں، جماعتوں ہی سے پروان چڑھتی ہیں اور جماعتیں افراد پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اگر افراد کی صلاحیتیں برومند ہوں تو تحریکوں کی کامیابی یقینی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

دوسرے یہ کہ "علم اور محنت" کی میزان میں رکھ کر دیکھئے تو طلوع اسلام کی تحریک ابھی تک فردِ واحد — پرویز صاحب — ہی کی رہین منت ہے۔ سوچئے کہ اگر ہم بھی اس کے ساتھ اتنا ہی کام کریں جتنا یہ فردِ واحد کرتا ہے۔ تو یہ تحریک کہاں سے کہاں نہ پہنچ جاتے۔ یہ حقیقت کہ ہم آج اتنی کثیر تعداد میں اس جگہ جمع ہیں، اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ

حق کی آواز کبھی صدا بالصحرا ثابت نہیں ہوتی

اگر ایک فرد کے حلق سے نکلی ہوئی حق کی آواز اس قدر خوشگوار نتائج پیدا کر سکتی ہے تو اگر ہماری آوازیں بھی اس ایک آواز سے ہم آہنگ ہو جائیں، تو ان کا مجموعی اثر کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیگا۔ اگر ہم نے ایسا کر دیا تو اس سے نہ صرف پاکستان کی تقدیر بدل جائے گی بلکہ پوری نوع انسان کے مقدرات کے ستارے جگمگا اٹھیں گے۔ والسلام

قرآنی فیصلے

جلد اول و دوم!

ان کتابوں کی مانگ بہت بڑھ رہی ہے اس لئے فرمائشوں کی تعمیل میں قدرے تاخیر ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے ہم خریدار حضرات سے معذرت خواہ ہیں آئندہ ہم ہر ممکن کوشش کریں گے کہ اس میں تاخیر نہ ہو۔ یہ کتابیں صرف چیپ ایڈیشن میں شائع کی گئی ہیں۔ ہر ایک جلد کی قیمت 3/25 روپے ہے۔

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوع اسلام ۲۵/ بی گلبرگ — لاہور

راستے کے کانٹے

مذاکرہ ختم ہو گیا تو فکر پرویز کے ماحول کی پروردہ دو بچیاں آگے بڑھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ آپ بزرگوں نے ان بڑے بڑے پتھروں کا ذکر کیا ہے جو تحریک طلوع اسلام کے راستے میں بُری طرح حائل ہیں لیکن میں آپ کی توجہ ان کانٹوں کی طرف مبذول کرانا چاہتی ہوں جو ہمارے اسکول کے راستے میں بکھرے رہتے ہیں اور جن سے ہمارے تلوے ہر روز چھلنی ہوتے ہیں۔

لیکن اس کی بڑی بہن نے کہا کہ اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں جس بات کی مخالفت نہ ہو وہ حق کی آواز ہو نہیں سکتی۔ بچیوں کے یہ تاثرات بڑے ہی اثر انگیز تھے۔ ان سے متاثر ہو کر ایک بزرگ نے انہیں پچاس روپے انعام دیا۔ ان بچیوں نے اسے بہ شکریہ قبول کیا اور اسے اپنی طرف سے کالج فنڈ میں دے دیا۔ آئندہ صفحات میں ان بچیوں کی تقاریر ملاحظہ فرمائیے۔

عزیزہ سلمیٰ پرویز

کشمکش

میرے واجب الاحترام بزرگو ! اپنی بیٹی کا سلام لو۔

آپ کے سامنے سوال یہ ہے کہ ہماری طلوعِ اسلام کی تحریک کے راستے میں کونسے سنگِ گراں ہیں جو اس کی رفتار میں رکاوٹ بنکر حائل ہوجاتے ہیں۔ آپ نے مختلف تقریروں میں اس اجمال کی تفصیل سنی لیکن وہ جگ بیتی تھی۔ میں آپ کو آپ بیتی سنانا چاہتی ہوں۔

میری آنکھ اُس گھر میں کھلی جس کی فضا طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر سے معمور تھی۔ بچپن ہی سے قرآن پاک کی تعلیم سے کان آشنا ہوگئے۔ جب میں قریب پانچ سال کی ہوئی تو اسکول بھیجنے کا سوال سامنے آیا۔ ہم اس زمانے میں کراچی میں تھے۔ کراچی میں اُسوقت، صرف عیسائی مشنریوں کے اسکول ایسے تھے جنکی شہرت اچھی تھی۔ —— —— لیکن اُن میں داخلہ بڑی مشکل سے ملتا تھا۔ کئی ماہ کے انتظار کے بعد خدا خدا کرکے داخلہ ملا۔ میں خوشی خوشی اسکول گئی۔ اسکول کے صحن میں سنگِ مرمر کا حضرت یسوع مسیح کا مجسمہ تھا۔ میں نے اوپر نگاہ اُٹھائی تو اتفاق سے ایک کوا اُس مجسمے کے سر پر بیٹھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے وہاں بیٹ کر دی، تو میں نے سسٹر سے کہا کہ ذرا مجھے بتایئے، کہ جو اپنے اوپر سے کوّے کو بھی نہیں اُڑا سکتا، درانحالیکہ وہ اُس کے سر پر بیٹ کر رہا ہے، وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے؟ سسٹر خاموش رہی، لیکن اُس نے غصے میں میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ دو تین دن کے بعد، وہ کلاس میں ہمیں بتا رہی تھی کہ ہمارے خداوند خدا یسوع مسیح ہمیں دوزخ کی آگ سے بچائیں گے۔ اُس دن گرمی بڑی سخت تھی اور حضرت مسیح کا مجسمہ دھوپ میں کھڑا جل رہا تھا۔ میں نے کہا کہ سسٹر ! جو خدا اپنے آپ کو دھوپ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا، وہ ہمیں دوزخ کے عذاب سے کیسے بچا ئیگا !

دوسرے دن پرنسپل نے باباجی کو بلا کر کہدیا کہ آپ کی بیٹی ہمارے اسکول میں نہیں رہ سکتی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد، ایک اور اسکول میں داخلہ ملا۔ وہ مسلمانوں کا اسکول تھا۔ امتحان قریب آئے تو

۔ اُستانیوں نے کہا کہ کل اسکول میں آیتِ کریمہ کا ختم ہوگا۔ میں نے پوچھا کہ اس میں کیا ہوگا۔ اور اس سے کیا مقصد ہے۔ اُستانی نے کہا کہ سوا لاکھ بار آیتِ کریمہ پڑھی جائے گی اور جو لڑکیاں اس میں حصہ لیں گی وہ امتحان میں کامیاب ہو جائیں گی۔ میں نے کہا کہ آپ سارا سال ہمیں یہ کہتی رہی ہیں کہ بچیو! محنت کرو۔ خوب پڑھائی کرو تاکہ تم امتحان میں پاس ہو جاؤ۔ اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ جو لڑکی آیتِ کریمہ کے ختم میں حصہ لے گی وہ امتحان میں پاس ہو جائے گی اس کا مطلب کیا ہوا۔ بات بڑھ گئی اور اسکول کی ساری اُستانیاں میرے خلاف ہو گئیں۔ اس کا نتیجہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں لاہور آنے پر جس اسکول میں داخلہ ملا وہ اگرچہ گورنمنٹ کا اسکول تھا لیکن اُستانیاں سب مسلمان تھیں۔ اب یہاں اسلامیات بھی پڑھایا جاتا تھا۔

امتحان میں سوال آیا کہ شبِ برات کیوں منائی جاتی ہے۔ اس کی اہمیت بیان کرو۔ میں نے لکھا کہ یہ آتش پرستوں کا تیوھار تھا۔ عباسی خلیفوں کے وزیر نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ وہ اس تیوہار کو اپنے ساتھ لائے اور اسے اسلامی رنگ دے دیا۔ یہ بیان اسلامیات کی کتاب سے بھی مختلف تھا اور مسلمانوں کے مُروجہ عقیدہ سے بھی۔ نتیجہ یہ کہ اسلامیات میں فیل کر دی گئی۔ بابا جی سے پوچھا کہ بتایئے ہم ایسے میں کیا کریں۔ اگر کتاب کے مطابق لکھتے ہیں تو طلوعِ اسلام کی پیش کردہ فکر کے خلاف ہوتا ہے۔ یعنی اس تعلیم کے خلاف جسے ہم سچا سمجھتے ہیں۔ اگر سچائی کے مطابق لکھتے ہیں تو فیل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی بات میں نے کوئی تین سال اُدھر آپ بزرگوں سے بھی پوچھی تھی۔ اور آپ نے بھی اس کا جواب کچھ نہیں دیا تھا۔

پچھلے سال کچھ اُمید کی کرن نظر آئی تھی جب آپ نے کنونشن میں اپنا کالج کھولنے کی تجویز پاس کی تھی۔ ہم نے خیال کیا تھا کہ اس سال آپ آئیں گے تو اس کا سنگِ بنیاد رکھا جائے گا۔ لیکن اس کنونشن میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اب آپ کنونشن کے بعد پھر واپس تشریف لے جائیں گے اور ہم پھر اسلامیات کا یہ درس دُہرانے لگ جائیں گے کہ شام کے وقت سورج اللہ میاں کے عرش کے نیچے جا چھپتا ہے اور دوسری صبح فرشتے اُسے کچوکے دے دے کر وہاں سے نکالتے ہیں۔ اور اس کے بعد آپ پھر مذاکرہ منعقد کریں گے یہ سوچنے کے لئے کہ طلوعِ اسلام کی آواز تیزی سے کیوں نہیں پھیلتی۔

میرے بزرگو! جب تک ہماری تعلیم کا نصاب نہیں بدلتا طلوعِ اسلام کی آواز آگے بڑھ نہیں سکتی۔

آپ نے کچھ کرنا ہے تو یہ کیجئے۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی آپ کریں گے اُس سے آپ کو ثواب تو ضرور ہوگا۔ لیکن اُس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ لیکن پھر مصیبت یہ ہے کہ آپ اُس ثواب کے بھی قائل نہیں جس کا نتیجہ کچھ نہ نکلے۔

بہر حال، تعلیمی بے بسی اور طلوعِ اسلام کی آواز نے ہمیں تو اس کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے کہ

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر ؎ کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

جب تک آپ ہمیں اس کشمکش سے نہیں نکالتے طلوع اسلام کی کشتی اس گرداب سے نہیں نکل سکتی -
والسلام

عزیزہ نجمہ

حق کی آواز کی مخالفت

صدر محترم و سامعین حضرات -

طلوع اسلام حق اور صداقت کی آواز کا نقیب ہے - اس آواز کو دبانے کے لئے مختلف گوشوں سے جو کوششیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان کے متعلق آپ نے مختلف تقاریر میں سُن لیا - بے شک اس کی مخالفت سخت ہو رہی ہے - لیکن میں نے جو کچھ تاریخ سے پڑھا ہے اس سے تو ایسا نظر آتا ہے کہ حق کی آواز اور اُسکی مخالفت لازم و ملزوم ہیں - میری نظر سے کوئی تاریخی واقعہ ایسا نہیں گزرا کہ کسی نے حق کی آواز اُٹھائی ہو اور اس کی مخالفت نہ ہوئی ہو - یونان کے قید خانے میں جب سقراط کے ہاتھ میں زہر کا پیالہ دیا گیا تو اُس نے کسی کو قتل نہیں کیا تھا جس کی پاداش میں اُسے سزائے موت دی جا رہی تھی - اس کا جرم اتنا ہی تھا کہ وہ اپنی بصیرت کے مطابق حق و صداقت کی بات کہہ رہا تھا جو اہل یونان کے عقائد کے خلاف جاتی تھی - حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عزیز، رشتہ دار - گھر بار - ملک کیوں چھوڑنا پڑا - اس لئے نہیں کہ وہ کوئی جرم کر کے بھاگے تھے - محض اس لئے کہ وہ حق کی آواز بلند کرتے تھے - حضرت یوسف علیہ السلام کو محلات کی ناز و نعمت کی زندگی سے نکل کر قید خانے کی سختیاں کیوں برداشت کرنی پڑی تھیں - اس لئے نہیں کہ انہوں نے کسی کی امانت میں خیانت کی تھی - بلکہ محض اس لئے کہ وہ صداقت کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے - حضرت مسیح علیہ السلام کو اسقدر جانکاہ مصیبتوں کا تختۂ مشق کیوں بننا پڑا محض اس لئے کہ وہ خدا کی آواز کو دوسروں تک کیوں پہنچاتے ہیں - اور پھر وہ ذات گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ جن کی سچائی کے صدقے

ہم مسلمان کہلاتے ہیں۔ ان کی ساری زندگی مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرتے گذر گئی۔ مکے کی تیرہ سالہ زندگی ایسی ایسی لرزہ خیز مشکلات سے گزری جن کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے پھر مدینہ کی دس سالہ زندگی دشمنوں کی تلواروں کا مقابلہ کرتے گزر گئی۔ یہ سب کیوں تھا۔ محض اس لئے کہ حضورؐ حق کی آواز کے علمبردار تھے۔ آپؐ کے بعد بھی دیکھئے۔ وہ کون ہے کہ جس نے اپنے زمانے کی عام روش کے خلاف حق کی بات کہی ہو اور زمانہ اس کا مخالف نہ ہو گیا ہو؟ ہمارے موجودہ دور کی تاریخ ہی دیکھئے۔ سرسید (علیہ الرحمتہ) کہ جن کے ہاتھوں رکھی ہوئی اینٹ پر پاکستان کی عمارت استوار ہوئی ہے ان کے خلاف کفر کے فتوے مکہ معظمہ سے منگائے گئے۔ علامہ اقبال کو کافر کہا گیا۔ قائد اعظم کو کافرِ اعظم کہہ کر پکارا گیا۔ ان کا جرم اس کے سوا کیا تھا کہ یہ قوم کو غلامی کی ذلت سے نکال کر آزادی کی عظمت عطا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لئے اگر آج طلوعِ اسلام کی اسقدر مخالفت ہو رہی ہے اور میرے باباجی کو کافر بنایا جا رہا ہے۔ تو میں تو اس پر بہت خوش ہوں کہ اس آواز کو حق و صداقت کی آواز ہونے کی سند مل رہی ہے۔

پھر آپ اس پر بھی غور کیجئے کہ حق و صداقت کی آواز بلند کرنے والوں کو اگر تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تو اسلئے نہیں کہ ان کے سامنے ان تکالیف سے بچنے کی کوئی راہ نہیں تھی۔ راہ کیوں نہیں تھی۔ ان کے سامنے سب دروازے کھلے تھے۔ بس شرط ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ وہ حق کی آواز بلند کرنا چھوڑ دیں۔ تکالیف سے بچنے کے راستے ہی کھلے نہیں تھے۔ ان کے لئے دنیا بھر کی دولت اور آسائش کے سامان بھی تیار تھے۔ لیکن انہوں نے ان چیزوں کی طرف کبھی مڑ کر بھی نہ دیکھا بلکہ اپنے مشن کی خاطر انہیں ضرورت پڑنے پر از خود تیاگ دیا۔ باباجی اپنی پریشانی یا مشکلات کا ذکر گھر میں کبھی نہیں کرتے ۔ اگر ہم کبھی ان چیزوں کو بھانپ لیتے ہیں تو ان کی تاکید ہوتی ہے کہ ان کا تذکرہ کسی سے نہ کیا جائے۔ اگر یہ پابندی نہ ہوتی تو میں آپ بزرگوں کو بتاتی کہ وہ نہایت دیانتداری سے ملازمت کرتے ہوئے کس قدر آرام کی زندگی بسر کر سکتے تھے اور طلوعِ اسلام کی وجہ سے وہ کس کس قسم کی دشواریوں اور پریشانیوں کا سامنا کر رہے ہیں۔ جب میں چھوٹی سی تھی تو میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ وہ ایک دن میں ان تمام پریشانیوں کو ختم کر سکتے ہیں۔ پھر ایسا کیوں نہیں کرتے؟ لیکن اب میں سمجھتی ہوں کہ وہ ایسا کیوں نہیں کرتے۔ انہیں ایسا کرنا ہی نہیں چاہیئے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ اب ان کے لئے "چاہیئے" کا سوال ہی نہیں رہا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ وہ جانتے ہیں کہ حق و صداقت کا چراغ تیل سے نہیں خونِ جگر سے جلا کرتا ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر طلوعِ اسلام کا یہ ننھا سا دیا بجھ گیا تو فضا پر کس قدر تاریکیاں چھا جائیں گی۔ لہٰذا میرے بزرگو! طلوعِ اسلام کی تحریک کو جس قدر مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ان مخالفتوں کی ٹھوکریں سے

تو اس ندی کی روانی میں تیزی آتی ہے۔ اور اس حقیقت سے کون بے خبر ہے

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اور اب تو اس سحر کے پیدا ہونے میں زیادہ دیر بھی نظر نہیں آتی۔

والسلام

رابطہ باہمی

بزمِ کراچی

کراچی کی سابقہ بزم کے کالعدم قرار دیئے جانے کے بعد، ہاں نئی بزم کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ ادارہ اس جدید بزم کو منظور کرتا ہے۔ اس بزم کے زیرِ اہتمام درس قرآن کریم کا سلسلہ بحسن و خوبی جاری ہو چکا ہے فالحمد للہ علی ذالک۔ درس کے سلسلہ میں معلومات حسب ذیل احباب سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

(۱) محترم محمد اسلام صاحب — پرویز پیٹیٹ پیلس ۲۰۵ میریٹ روڈ کراچی
ٹیلی فون ۳۵۸۸۰

(۲) محترم لطیف الرحمٰن صدیقی — ۵ بزرما لائنز — کراچی
ٹیلی فون ۵۵۱۲۷

آجکل درس قرآن میں پرویز صاحب کے حالیہ کنونشن کے خطابات سُنائے جا رہے ہیں۔ جو بصیرت قرآنی۔ ندرتِ فکر اور حسن بیان کے شاہکار ہیں۔

(۳) ادارہ طلوع اسلام کا لٹریچر اور رسالہ طلوع اسلام بھی بزم مذکور سے

مل سکے گا

پھاٹک کھُل گیا

جماعتِ اسلامی نے اس سے پہلے "دین میں تحریف" اور "خدا اور رسُول کے نام پر" اپنی آمریت کے لئے کئی کھڑکیاں اور دروازے کھولے تھے لیکن "عورت کے سربراہِ مملکت ہونے" کے مسئلہ کے سلسلہ میں اس نے جو موقف اختیار کیا ہے اس نے اس باب میں گویا ایک بہت بڑا پھاٹک کھول دیا ہے۔ چونکہ ان کی یہ روش، مستقبل میں ایک ایسے عظیم فتنہ کا موجب بننے والی ہے جس کے شعلے "دین کے خرمن کو (معاذ اللہ) جلا کر راکھ کر دیں گے" اور جس سے یہ لوگ "شریعت کے نام پر" جو جی میں آئے کرتے چلے جائیں گے اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مسئلہ کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے اور اس فتنہ کی روک تھام کی کوشش کی جائے۔

سوال یہ درپیش تھا کہ کیا اسلام میں عورت سربراہِ مملکت ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں جماعتِ اسلامی کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے جو روش اختیار کی گئی اسے اُنہی کے الفاظ میں سنئے۔ انہوں نے اپنے شائع کردہ پمفلٹ میں لکھا ہے کہ

> "جب یہ مرحلہ (یعنی حزبِ مخالف کی مجلسِ مشاورات میں مس فاطمہ جناح کی صدارت کے لئے بطورِ امیدوار نامزدگی کا مرحلہ) آیا تو ہم اس پیچیدہ صورتِ حال سے دوچار ہو گئے کہ چار جماعتوں نے محترمہ مس فاطمہ جناح کو منتخب کرنے پر اتفاق کر لیا ہے جسے قبول کرنا ان شرعی احکام کی موجودگی میں ہمارے لئے مشکل تھا جن کی رُو سے کوئی عورت مسلمانوں کی امیر نہیں ہو سکتی۔ اس بناء پر ہم نے صدارت کے مسئلہ میں حزبِ اختلاف کے ساتھ اتفاق یا ان سے علیحدگی کا کوئی اعلان نہیں کیا تاکہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح

جائزہ لینے اور اہلِ علم سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔

اس کے بعد (محولہ بالا پمفلٹ میں) لکھا ہے۔

"اب کافی غور اور مشورے کے بعد جماعت جس نتیجے پر پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں سے بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت سے تبدیل نہیں ہو سکتی اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقعہ پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب یہ واضح ہے کہ عورت کو امیر بنانے کی ممانعت ان حرمتوں میں سے نہیں ہے جو ابدی اور قطعی ہیں بلکہ دوسری قسم کی حرمتوں میں ہی اس کا شمار ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد اس پمفلٹ میں کہا گیا ہے کہ ملک میں جو حالات پیدا ہو چکے ہیں، ان کے پیشِ نظر:

"اس انتخاب کو قبول کرنا شرعاً ناجائز نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ جماعت یہ امر بھی پوری طرح واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اصل شرعی قاعدہ علیٰ حالہٖ قائم ہے اور موجودہ غیر معمولی حالات میں اس طرح کا کوئی فیصلہ آئندہ کے لئے نظیر نہیں بن سکتا۔

جس وقت جماعتِ اسلامی نے یہ فیصلہ کیا تھا، ان کے امیر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب جیل میں تھے۔ چند دنوں کے بعد وہ باہر آئے تو انہوں نے جماعت کے اس فیصلہ کی تصویب کر دی۔ چنانچہ اخبارات میں شائع شدہ خبروں کے مطابق

"اپوزیشن کی صدارتی امیدوار محترمہ مس فاطمہ جناح پر اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودی نے چیلنج کیا ہے کہ کوئی شخص یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ از روئے شرع، عورت کا سربراہِ مملکت ہونا قطعی حرام ہے اور اس سلسلہ میں استثناء کی گنجائش نہیں۔

(مشرق۔ مورخہ ۱۲ ر اکتوبر ۱۹۶۴ء)

پھر انہوں نے لاہور کے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا

صدارتی امیدوار کے سلسلہ میں جماعت نے بڑے نپے تلے الفاظ میں اپنی اپوزیشن کی وضاحت کر دی تھی۔ عام حالات میں اصول کے مطابق صدر مرد ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن اصل چیز جمہوریت کی بحالی ہے۔ اگر ایک طرف کسی امیدوار میں اس کے سوا کوئی اور خامی نہ ہو کہ وہ عورت ہے۔ اور دوسری طرف مرد امیدوار ہیں

> اس کے سوا کوئی خوبی نہ ہو کہ وہ مرد ہے تو اس صورت میں اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا کہ خاتون امیدوار کی حمایت کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مس فاطمہ جناح کا ساتھ دے رہے ہیں۔
> (ایشیا۔ مورخہ ۳۱–۱۰–۶۴)

اس وقت ہم اس تقریر کا تجزیہ نہیں کر رہے۔ (یہ بعد میں کیا جائے گا) سردست ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب نے بھی جماعت کے اس فیصلہ کی تائید کی ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ اس فیصلے کے اثرات و نتائج کیا ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ

۱۔ شریعت میں بعض حرمتیں ابدی ہیں اور بعض قابلِ تغیر۔

۲۔ عورت کی سربراہی کا مسئلہ ابدی حرمتوں میں سے نہیں ہے۔

۳۔ حالات ایسے پیدا ہو چکے ہیں کہ اس حرمت کو حلت میں تبدیل کر لیا جائے۔

۴۔ جب حالات ایسے نہیں رہیں گے تو پھر یہ حلت حرمت میں بدل جائیگی۔

اللہ تعالیٰ نے حرام اور حلال کا فیصلہ اپنی کتاب میں کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس فیصلہ میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکے۔ حتیٰ کہ نبی اکرمؐ نے جب کسی شے کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا (یعنی کسی حرام کو حلال نہیں قرار دیا بلکہ کسی حلال کو حرام قرار دے لیا) تو آپ کو اس پر فوراً متنبہ کیا گیا کہ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ ــــ (۱/۶۶)۔ اے نبی! جس چیز کو خدا نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے تو اسے حرام کس طرح قرار دے سکتا ہے؟ یہ ہے قرآن کی رو سے حلت و حرمت کی پوزیشن۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم میں حرام کی فہرست میں کہیں یہ تصریح کی گئی ہے کہ اس میں سے فلاں فلاں چیزوں کی حرمت ابدی ہے اور فلاں کی حرمت قابلِ تغیر و تبدل؟ (اس میں کھانے پینے کی حرام چیزوں کے سلسلہ میں اتنا کہا گیا ہے کہ اضطراری حالت میں، انہیں بقدرِ ضرورت کھایا جا سکتا ہے)۔ اب آپ سوچئے کہ اگر انسانوں کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ وہ خدا کی حرام کردہ چیزوں کے متعلق یہ فیصلہ کرنے بیٹھ جائیں کہ فلاں چیز کی حرمت ابدی ہے اور فلاں کی قابلِ تغیر، تو اس سے حرماتِ دینی کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے؟ اس سے دین بازیچۂ اطفال بن جائے گا کہ جس کا جی چاہے اس سے کھیل کھیلتا رہے۔ جس حرام چیز کو چاہے، یہ کہہ کر حلال قرار دے لے کہ اس کی حرمت ابدی نہیں، قابلِ تغیر ہے۔

جماعتِ اسلامی نے کہا ہے کہ عورت کی سربراہی کی حرمت ابدی نہیں، قابلِ تغیر ہے۔ اس نے نہ تو اس کی سند دی ہے کہ عورت کی سربراہی حرام ہے اور نہ ہی اس کی سند کہ یہ حرمت ابدی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس جماعت کو اس کا حق کیسے حاصل ہو گیا کہ وہ جس چیز کو چاہے پہلے حرام قرار دے لے اور پھر اس کی حرمت کے متعلق یہ فیصلہ کرے کہ

وہ ابدی نہیں قابلِ تغیر ہے۔ یہ تو خالص خدائی اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے لینا ہے۔

اس کے بعد جماعت نے کہا ہے کہ حالات ایسے پیدا ہو چکے ہیں کہ اس حرمت کو حلت میں تبدیل کر لیا جائے۔ اس پر پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس جماعت کو یہ اختیارات کیسے حاصل ہو گئے کہ وہ فیصلہ کرے کہ اب حالات ایسے پیدا ہو چکے ہیں کہ فلاں حرمت کو حلت میں بدل لیا جائے۔ اور اس کے بعد جب جی چاہے وہ یہ حکم صادر کرے کہ اب وہ حالات بدل چکے ہیں اس لئے یہ حلت پھر حرمت میں بدل جاتی ہے۔

آپ غور فرمائیے کہ اگر کسی فرد یا کسی جماعت کو شریعت کے معاملات میں اس قسم کے اختیارات حاصل ہو جائیں تو اس کے ہاتھوں اُمت بیچاری کی حالت کیا ہوگی؟ یہ اتنا بڑا استبداد ہے جس کی نظیر ھلاکو اور چنگیز خان کے ہاں بھی نہیں ملے گی۔ وہ اپنے فیصلوں کو کبھی "خدا اور رسول" کے فیصلے کہہ کر نہیں منواتے تھے۔ لیکن یہ حضرات آمریت اور استبداد تو ھلاکو اور چنگیز خانی مسلط کریں گے لیکن اسے منوائیں گے "خدا اور رسول" کے فیصلے کہہ کر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے فیصلوں کی مخالفت یا ان کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والا "خدا اور رسول" کے فیصلوں کے خلاف سرکشی و بغاوت کا مرتکب قرار دیا جائے گا جس کی سزا قتل ہوگی۔ مملکت میں کسی شخص کو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ کونسی حرمت کب حلت میں بدل جائے گی اور کونسی حلال شے حرام قرار دے دی جائے گی۔ حلت و حرمت ان حضرات کے منشاء کے مطابق صبح شام بدلتی رہے گی۔ اور آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ آپ ان کے فیصلوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔ یہی وہ تھیاکریسی کا استبداد ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ اور جسے اب پاکستان میں آپ کے سر پر اس طرح مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس اصولی بحث کے بعد یہ دیکھئے کہ خود مودودی صاحب اس مسئلہ کے متعلق پہلے کیا کہہ چکے ہیں۔ جب پاکستان کی مجلس دستور ساز میں آئین کی تدوین کا مسئلہ زیرِ غور تھا تو انہوں نے اپنی دستوری تجاویز پیش کی تھیں۔ ان میں ایک شق یہ بھی تھی کہ

> "مجالس دستور ساز کی رکنیت کا حق عورتوں کو دینا مغربی قوموں کی اندھی نقالی ہے۔ اسلام کے اصول ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتے۔ اسلام میں سیاست اور انتظامِ ملکی کی ذمہ داری صرف مردوں پر ڈالی گئی ہے۔ اور یہ فرائض عورتوں کے دائرہ عمل سے خارج ہیں۔"

آپ اس تجویز کے خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ

۱۔ انتظامِ ملکی اور سیاست کے فرائض عورتوں کے دائرہ عمل سے خارج ہیں۔

۲۔ اس لئے اسلام کے اصول اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتے کہ یہ فرائض عورتوں کے سپرد کر دیئے جائیں ۔(۱)

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ مودودی صاحب کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ فرائض عورتوں کے دائرہ عمل سے خارج ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو بات کسی کے دائرہ عمل ہی سے خارج ہو، اس میں کسی اضطراری حالت یا استثناء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ "بچہ جننا" مرد کے دائرہ عمل سے خارج ہے۔ اگر کسی جزیرے میں اتفاق سے مرد ہی مرد ہوں۔ عورت کوئی نہ ہو۔ اور اس وقت یہ کہہ دیا جائے کہ ایسی اضطراری حالت پیدا ہو گئی ہے جس میں، اس اصول میں استثناء کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اب شرعاً جائز ہے کہ کسی مرد کو بچے جننے کے فریضہ کے لئے منتخب کر لیا جائے۔ تو ایسا فتویٰ دینے والے کے متعلق جو رائے آپ قائم کریں گے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہ وجہ تھی کہ جب مودودی صاحب کی اس تجویز پر اعتراضات ہوئے تو انہوں نے ان کے جواب میں بڑی تفصیل سے ثابت کیا کہ خدا نے قرآن میں اور رسول اللہؐ نے اپنی احادیث میں واضح کر دیا ہے کہ امورِ مملکت میں حصہ لینا عورت کے دائرہ عمل سے خارج ہے۔ اسی لئے جب نبی اکرمؐ تک یہ خبر پہنچی کہ اہلِ ایران نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا سربراہ بنا لیا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کئے ہوں"۔ خدا نے عورت کو خاص فرائض کی سرانجام دہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ جن فرائض کی سرانجام دہی کے لئے اسے پیدا ہی نہیں کیا گیا، اگر وہ فرائض اس کے سپرد کر دیئے جائیں گے، تو وہ ان فرائض کو سرانجام دے ہی نہیں سکے گی کیونکہ وہ پیدائش کے اعتبار سے ان فرائض کی سرانجام دہی کی اہل نہیں۔ اس میں سوال "جائز اور ناجائز" کا ہے ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے خدا نے عورت کو پیدا ہی نہیں کیا، اس کے ذریعے اس مقصد کا حصول ہو کیسے سکتا ہے۔ خدا کا ارشاد ہے کہ امورِ سیاست کی سرانجام دہی عورت کے دائرہ عمل سے باہر ہے۔ وہ اس کے لئے پیدا ہی نہیں کی گئی۔ اگر ہزار علماء بھی اکٹھے ہو کر فتویٰ دے دیں کہ امورِ سیاست کی سرانجام دہی عورت کے لئے شرعاً جائز ہے، تو کیا اس فتویٰ کی رو سے، عورت ان امور کی سرانجام دہی کے اہل ہو جائے گی؟ یعنی کیا علماء کا فتویٰ، خدا کی تخلیق میں تبدیلی پیدا کر دے گا؟ اس باب میں، مودودی صاحب کے سامنے پوزیشن کس قدر واضح تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ کچھ عرصہ ہوا ایک صاحب (ایم محی الدین لکھنوی۔ بی۔ اے

مس فاطمہ جناح کے متعلق

ایل۔ ایل۔ بی) نے مودودی صاحب سے یہ سوال پوچھا کہ کیا اسلام میں امورِ سیاست عورت کے سپرد کئے جا سکتے ہیں۔ اور اس ضمن میں متعین طور پر کہا کہ

(۱) ملاحظہ فرمائیے ترجمان القرآن بابت ستمبر ۱۹۵۲ء

"اگر آج محترمہ مس فاطمہ جناح صدارت کا عہدہ سنبھال لیں تو اسلامی اصول، پاکستان کے اسلامی نظام میں اس کی اجازت دیں گے۔

یہ سوال۔ اور اس کا جواب محی الدین صاحب نے اپنی کتاب "اسلام بیسویں صدی میں" کے صفحات ۲۶۵ تا ۲۷۲ میں شائع کئے ہیں۔ یہ کتاب نومبر ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ سوال آپ نے دیکھ لیا۔ اب مودودی صاحب کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ انہوں نے لکھا۔

مودودی صاحب

"اسلامی حکومت دنیا کے کسی معاملے میں بھی اسلامی اصولوں سے ہٹ کر کوئی کام کرنے کی نہ تو مجاز ہے اور نہ وہ اس کا ارادہ ہی کر سکتی ہے اگر فی الواقع اس کو چلانے والے ایسے لوگ ہوں جو اسلام کے اصولوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور اس پر عمل کرتے ہوں۔ عورتوں کے معاملے میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ عورت اور مرد عزت و احترام کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اخلاقی معیار کے لحاظ سے بھی برابر ہیں لیکن دونوں کا دائرہ عمل ایک نہیں ہے۔ سیاست اور ملکی انتظام اور فوجی خدمات اور اسی طرح کے دوسرے کام مرد کے دائرہ عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دائرے میں عورت کو گھسیٹ لانے کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں۔ یا تو یہ کہ ہماری خانگی زندگی بالکل تباہ ہو گی جس کی بیشتر ذمہ داریاں عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں یا پھر عورتوں پر دوہرا بار ڈالا جائیگا کہ وہ اپنے فطری فرائض بھی انجام دیں جن میں مرد قطعاً شریک نہیں ہو سکتا ——— اور پھر مرد کے فرائض کا بھی نصف حصہ اپنے اوپر اٹھائیں عملاً یہ دوسری صورت ممکن نہیں ہے۔ لازماً پہلی صورت ہی رونما ہو گی اور مغربی ممالک کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ رونما ہو چکی ہے۔ آنکھیں بند کر کے دوسرے کی حماقتوں کی نقل اتارنا عقلمندی نہیں ہے۔

محی الدین صاحب نے اپنے سوال میں یہ بھی کہا تھا کہ اسلام کے قرن اول میں عورتوں نے میدان جنگ میں مرہم پٹی کے فرائض سر انجام دیئے۔ نیز انہوں نے ایسی عورتوں کے نام گنوائے تھے جنہوں نے امور مملکت کو بخوبی سر انجام دیا۔ سوال کے اس حصے کے متعلق مودودی صاحب نے لکھا۔

"اسلام میں اگر جنگ کے موقع پر عورتوں سے مرہم پٹی وغیرہ کا کام لیا گیا ہے تو اس کے معنی

یہ نہیں ہیں کہ امن کی حالت میں عورتوں کو دفتروں اور کارخانوں اور کلبوں اور پارلیمنٹوں میں لاکھڑا کیا جائے مرد کے دائرہ عمل میں آ کر عورتیں کبھی مردوں کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں اس لئے کہ وہ ان کاموں کے لئے بنائی نہیں گئی ہیں۔ ان کاموں کے لئے جن اخلاقی اور ذہنی اوصاف کی ضرورت ہے وہ دراصل مرد میں پیدا کئے گئے ہیں۔ عورت مصنوعی طور پر مرد بن کر کچھ تھوڑا بہت ان اوصاف کو اپنے اندر ابھارنے کی کوشش کرے بھی تو اس کا دوہرا نقصان خود اس کو بھی ہوتا ہے اور معاشرہ کو بھی۔ اس کا اپنا نقصان یہ ہے کہ وہ نہ پوری عورت رہتی ہے نہ پوری مرد بن سکتی ہے اور اپنے اصلی دائرہ عمل میں جس کے لئے وہ فطرتاً پیدا کی گئی ہے ناکام رہ جاتی ہے۔ معاشرہ اور ریاست کا نقصان یہ ہے کہ وہ اہل کارکنوں کے بجائے نااہل کارکنوں سے کام لیتا ہے اور عورت کی آدھی زنانہ اور آدھی مردانہ خصوصیات سیاست اور معیشت کو خراب کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس سلسلہ میں گنتی کی چند سابقہ معروف خواتین کے نام گنانے سے کیا فائدہ۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ جہاں لاکھوں کارکنوں کی ضرورت ہو کیا وہاں تمام خواتین موزوں رہ سکیں گی؟ ابھی حال ہی میں مصر کے سرکاری محکموں اور تجارتی اداروں نے یہ شکایت کی ہے کہ وہاں بحیثیت مجموعی ایک لاکھ دس ہزار خواتین جو مختلف مناصب پر کام کر رہی ہیں۔ بالعموم ناموزوں ثابت ہو رہی ہیں اور ان کی کارکردگی مردوں کی نسبت ۵۵ فیصدی سے زیادہ نہیں۔ پھر مصر کے تجارتی اداروں نے یہ عام شکایت کی ہے کہ عورتوں کے پاس پہنچ کر کوئی راز، راز نہیں رہتا۔ مغربی ممالک میں جاسوسی کے جتنے واقعات پیش آتے ہیں ان میں بھی عموماً کسی نہ کسی طرح عورت کا دخل ہوتا ہے۔

اس جواب میں، ان الفاظ پر خاص طور پر غور کیجئے کہ ——— "عورتیں ان کاموں کے لئے بنائی ہی نہیں گئیں" اگر عورت کے سپرد یہ کام کر دے جائیں تو "وہ اپنے اصلی دائرہ عمل میں جس کے لئے وہ فطرتاً پیدا کی گئی ہے ناکام رہ جاتی ہے" یہ وہی بات ہے جس کے متعلق ہم اوپر بحث کر چکے ہیں۔ یعنی سوال جائز اور ناجائز کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے عورت بنائی ہی نہیں گئی وہ مقصد اس سے کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ ان امور کا عورتوں کے سپرد کر دینا "ناجائز" اس لئے ہے کہ خدا نے انہیں اس مقصد کے لئے پیدا ہی نہیں کیا۔ اور جس کام کے لئے خدا نے کسی کو پیدا نہ کیا ہو۔ اس کے سپرد وہ کام کر دینا، مشیت خداوندی کے خلاف جنگ کرنا ہے۔

یہ تھی وہ پوزیشن جس کی وضاحت مودودی صاحب نے اس سے پہلے اس شرح و بسط اور اس حتم و یقین کے ساتھ فرمائی تھی۔ اب وہ یہ فرماتے ہیں کہ

> ۔ اگر کسی اُمیدوار میں اس کے سوا کوئی اور خامی نہ ہو کہ وہ عورت ہے اور دوسری طرف مرد اُمیدوار میں اس کے سوا کوئی خوبی نہ ہو کہ وہ مرد ہے تو اس صورت میں اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا کہ خاتون اُمیدوار کی حمایت کی جائے
>
> (ایشیا ۔ ۱۰/۶۴ ۔ ۲۱)

سوال یہ ہے کہ جب مودودی صاحب نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ عورت کو خدا نے اس مقصد کے لئے پیدا ہی نہیں کیا کہ وہ امورِ مملکت میں حصہ لے، تو کیا ایسی صورت میں عورت، ان امور میں حصہ لینے کے قابل قرار پا سکتی ہے کہ اس کے مدِّ مقابل، مرد میں کوئی خوبی نہیں ۔۔۔ مودودی صاحب کے تجزیہ کے مطابق، عورت جب تک عورت ہے وہ فطرتاً اس کے اہل ہی نہیں کہ وہ امورِ مملکت سر انجام دے سکے۔ یہ خدا کا منشاء ہے۔ اس میں یہ سوال ہی نہیں کہ اس کے مدِّ مقابل مرد میں کونسی خوبی ہے اور کونسی خوبی نہیں ۔۔۔ مرد میں کوئی خوبی بھی نہ ہو۔ حتیٰ کہ ساری مملکت میں کوئی مرد ایسا نہ رہے جو امورِ مملکت کی سر انجام دہی کی اہلیت رکھتا ہو، تو عورت اُس صورت میں بھی ان امور کی سر انجام دہی کے اہل نہیں ہو سکتی۔ مرد اگر اس قابل نہیں رہے تو اس کے وجوہات خارجی ہونگے۔ لیکن عورت تو اپنی خلقت کے اعتبار سے ان امور کے لئے نا اہل ہے۔ اور جو کسی کام کے لئے خلقی طور پر نا اہل ہو، وہ کسی اضطراری حالت میں بھی اس کے اہل نہیں بن سکتا بکری گوشت کھا ہی نہیں سکتی خواہ دُنیا میں کوئی شیر (یا دیگر گوشت خور جانور) باقی نہ رہے۔ نہ ہی وہ ایسی حالت میں گوشت کھا سکتی ہے جبکہ دُنیا میں کہیں گھاس موجود نہ ہو ۔۔۔ اس لئے کہ وہ پیدائشی طور پر گوشت کھانے کی اہل نہیں۔ اگر یہ کہا جاتا کہ امورِ مملکت کی سر انجام دہی کے لئے عورتوں میں بمقابلہ مردوں کے کم صلاحیت ہے۔ تو پھر یہ کہا جا سکتا تھا کہ چونکہ حالت ایسی پیدا ہو گئی ہے جب مسدودہ صلاحیتوں کا مالک کوئی مرد نہیں اس لئے اب اس کے سوا راستہ کوئی نہیں کہ یہ امور عورت کے سپرد کر دیئے جائیں۔ لیکن جب عورت میں پیدائش کی رُو سے اس کام کی صلاحیت ہی نہیں تو کسی اہل مرد کی موجودگی یا عدم موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر، اگر دُنیا میں کسی مرد میں قوتِ رجولیت نہ رہے، تو اولاد پیدا کرنے کا فریضہ پھر بھی کسی عورت کے سپرد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ فطرت نے اسے اس مقصد کے لئے پیدا ہی نہیں کیا۔ (ہم اس مثال کے لئے قارئین کے حسنِ ذوق سے معذرت خواہ ہیں لیکن اس کے بغیر بات وضاحت سے ذہنوں میں نہیں آ سکتی تھی)۔ مودودی صاحب نے عورت کی جو خلقی پوزیشن بیان کی تھی اس کا یہ منطقی بلکہ فطری نتیجہ ہے۔

اس مقام پر ذرا ضمناً "اضطراری حالت" کے دعوے کو بھی سامنے لائیے۔ قرآن کی رُو سے، اگر

صورت ایسی پیدا ہو جائے کہ ایک شخص بھوک سے مر رہا ہو اور کوئی چیز کھانے کو مل نہ سکے تو ایک مسلمان کو اجازت ہے کہ وہ جان بچانے کی خاطر حرام شے کھالے۔ اسے اضطراری حالت کہتے ہیں۔ جب یہ حضرات کہتے ہیں کہ ملک میں ایسی اضطراری حالت پیدا ہو چکی ہے کہ عورت کے سربراہ ہونے کی حرمت کو حلت میں تبدیل کر لیا جائے، تو یہ اس امر کا اعتراف ہے کہ ملک میں کوئی مرد ایسا نہیں رہا جو امورِ صدارت کی سرانجام دہی کا اہل ہو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خود مودودی صاحب بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ حزبِ مخالف کے تمام لیڈروں میں، کوئی مرد ایسا نہیں (حتیٰ کہ خود مودودی صاحب بھی نہیں) جس میں امورِ صدارت کی سرانجام دہی کی صلاحیت ہو۔ لہٰذا اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ ملک، احرام کی طرف رجوع کرے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ ہے مودودی صاحب کی کیفیت۔ وہ آج (ایک مصلحت کے تابع) ایک بات کہتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ وہ بات ان کی اپنی نہیں۔ خدا اور رسول کی ہے۔ شریعت حقہ کی ہے۔ اور کل ہی جب ان کی مصلحت کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے تو اپنی پہلی بات کے بالکل برعکس فیصلہ دیدیتے ہیں اور اعلان پھر بھی یہی کرتے ہیں کہ یہ عین خدا اور رسول کا فیصلہ ہے۔ اسے شریعت کا حکم سمجھو۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ اگر (جیسا کہ یہ دن رات اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں) کل کو مملکت کے اختیارات ان کے ہاتھ میں آگئے تو یہاں "اسلام" کے نام سے کیا کچھ نہیں ہوگا! اس وقت یہاں کسی کا کچھ بھی محفوظ نہیں ہوگا۔ جو کچھ یہ چاہیں گے، شریعت کے نام پر کرتے جائیں گے۔

(واضح رہے کہ ہم نے عورت کی پوزیشن کے متعلق جو کچھ سابقہ صفحات میں لکھا ہے، وہ مودودی صاحب کے خیالات ہیں۔ ہمارے نہیں۔ قرآن کی رو سے عورت کی پوزیشن کے متعلق ہم ان صفحات میں متعدد بار لکھ چکے ہیں۔ اس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔

جہانِ نو

ادارہ کی مطبوعات کی تفصیلی فہرست جس میں ہر ایک کتاب کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے کہ اس سے اس کا پورا آئینہ سامنے آجاتا ہے۔ ایک کارڈ لکھ کر بلاقیمت طلب فرمائیے۔

اس کتاب کا برسوں سے انتظار تھا

اسلام کیا ہے

پرویز

ہمارا یہ دعوےٰ ہے (اور مبنی بر ایمان دعوےٰ) کہ اسلام، نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسلام ہے کیا تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ جیسے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام صرف یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل نہیں مل سکتا۔

اسلام ایک نظامِ حیات ہے جس کی بنیادیں چند غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں، اسلام بہ حیثیت ایک نظامِ حیات کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح اور دلکش انداز میں یکجا پیش کیا جائے ـــــ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔

کتاب سولہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر باب مصنف کے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبر فی القرآن کا ماحصل پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب:

(۱) ہمارے مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ میں آجائے تو انہیں علیٰ وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنا دے۔ اور

(۲) غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

کتاب قریب پونے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دو اقسام میں شائع کی گئی ہے۔

قسم اول۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ مضبوط جلد۔ حسین گرد پوش۔ قیمت فی جلد۔ آٹھ روپے

قسم دوم۔ مکینیکل پیپر۔ بکس بورڈ کور۔ قیمت فی جلد۔ چار روپے

فرمائش کے ساتھ اس کی تصریح کر دی جائے کہ کونسی قسم کی جلد مطلوب ہے

ملنے کا پتہ:- ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

سماجی برائیاں

(ایک فکر انگیز تجزیہ)

(یو-این-او- ڈے کی تقریب (لاہور) پر تقریر)

مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں سماجی برائیوں پر اپنے خیالات کا اظہار کروں خاص کر ان کا وہ رُخ جو ہماری صحت پر اثر انداز ہوتا ہے۔

سماجی برائیوں پر بات کرتے ہوئے معاً خیال آتا ہے کہ میں جو دوسروں کی برائیاں بیان کرنے لگا ہوں، دوسروں کی نظر میں یہی کیا کم برائی ہوگی کہ میں ان کی کمزوریاں بے نقاب کر رہا ہوں۔ اور وہ بھی اس دور میں! غالب کے عہد میں تو خیر سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا۔ اور یہاں تو بقول میر، سنگ اٹھانے بھی نہ پائے تھے کہ پتھر آیا۔ ڈرتا ہوں کہ اپنے گریباں میں جھانکنے کی دعوت ملے گی، آخر کو میں بھی تو اسی سماج کا فرد ہوں جس کی برائیوں کا ذکر کرنے لگا ہوں اور فرد ——— کہتے ہیں کہ فرد بھی (SOCIETY INTERNALIZED) ہوتا ہے سوسائٹی بہت سے افراد کا مجموعہ اور ان پر مشتمل جماعت ہی کا نام ہے۔ وہی اس کی اقدار مقرر کرتے ہیں، وہی اس کے لئے قوانین مرتب کرتے ہیں، وہی اس کے معیار۔ اور اس کی اچھائیاں برائیاں انہیں لوگوں کے نظریات کی مظہر ہوتی ہیں۔

یہاں جس بات کو ہم برائی کہتے ہیں، یہاں سے چند سو یا چند ہزار میل دور برائی نہیں کہلاتی۔ مثال کے طور پر ہم یہاں شراب کو برا جانتے ہیں (اگرچہ سرکاری طور پر اسے بند نہیں کیا گیا) مگر مغرب میں لوگ کھلے بندوں اسے فروخت کرتے اور خریدتے ہیں اگھروں میں کھانے کی میزوں پر اپنی اولاد کے ساتھ بیٹھ کر لوگ اس کا لطف

اٹھاتے ہیں۔ ہمارے یہاں ابھی تک ——— لفظ نوٹ فرما لیجئے "شاید کل میں ایسا نہ کہہ سکوں" ——— ابھی تک لڑکیوں کا کلبوں میں جانا، مردوں کے ساتھ سیر و سفر پر، کھیل تماشاؤں میں شریک ہونا معیوب سمجھا جاتا ہے مگر مغرب میں بن بیاہی لڑکیوں کا اپنے مرد دوستوں کا ذکر گھر میں، گھر سے باہر، برا نہیں سمجھا جاتا بلکہ روزمرہ کی بات ہے۔ مرد دوستوں کے ساتھ (DAITING) ایک معمول ہے۔

تو جو چیز یہاں بُرائی ہے وہاں نہیں، وہاں کی سوسائٹی کے معیار یہاں سے مختلف ہیں۔ اور آج جبکہ دنیا سمٹ رہی ہے۔ انسان نے فاصلوں کی دوری کو رفتار سے کم کر دیا ہے۔ صبح پاکستان میں، شام قاہرہ میں، رات پیرس اور صبح لندن میں گزارنا ممکن ہو گیا ہے۔ میں "یو این او" کی سٹیج سے کیسے ایک ایسی بات کو برائی کہوں جو ایک دوسری جگہ برائی نہیں۔ تو کیا پھر برائی کا وجود اضافی (RELATINE) ہے؟ برائی مطلق اور مستقل کوئی چیز نہیں؟ وہ جو کہتے ہیں (NOTHING GOOD OR BAD THINKING MAKES IT SO) ——— درست بات ہے؟ اگر انسانی معیاروں کو سامنے رکھیں تو یہی بات درست ماننی پڑیگی۔ انسان کی خود ساختہ سوسائٹی میں تو یہی کچھ ہوگا۔

اور مذہب کی دُنیا میں جائیں تو وہاں بھی ہمیں اچھائی، برائی، نیکی اور بدی کا ایک سا معیار نہیں ملتا۔ ہندومت میں تو انسان کا سارا مستقبل ہی پیدائش کے حادثے کے بل پر صُورت پذیر ہوتا ہے۔ علم و فلسفہ شودر کے لئے شجرِ ممنوعہ ہے اور کھیتی برہمن کے لئے۔

بُدھ مت ساری انسانی خواہشات کو برائیاں بتا کر ترکِ دنیا کا سبق دیتا ہے۔ عیسائیت عورت کو برائی کی جڑ قرار دے کر رہبانیت کا سبق دیتی ہے۔ چاہے ساری عیسائی دُنیا اس وقت سب سے زیادہ اس برائی کے گرد گھومتی ہے۔ مذاہب نے بھی یکساں معیار نہ دیا۔ اور سوسائٹی کا معیار میں کیسے مانوں کہ کسی وقت ساری کی ساری سوسائٹی، اس کا سب کا سب نظام ہی (EVLL) ہو سکتا ہے۔ پھر معیار کہاں سے آئے؟ کوئی ایسی اقدار ہیں جو تبدیل نہ ہوتی ہوں۔ کوئی ایسا مُقام ہے؟ کوئی ایسی آواز ہے؟ ——— ہاں ——— لا تبدیل لکلمات اللہ۔ اللہ کی بات، اس کے قانون کبھی تبدیل نہیں ہوتے، خدا کی بات کو معیار مان کر ہم آگے چل سکتے ہیں اور وہ ہمارے پاس ——— خود تاریخ گواہ ہے کہ وہ ہمارے پاس غیر تبدیل شُدہ حالت میں موجود ہے۔ اس آواز نے کسی انسانی قوّت یا جذبہ کو بُرا نہیں کہا (کسی انسان کو کسی دوسرے انسان سے کم نہیں کہا)۔ ان کا استعمال ہی انہیں اچھا یا بُرا بنا دیتا ہے۔ اگر وہ خدا کی دی ہوئی ہدایات کے مُطابق اس کی بتائی ہوئی حدود کے اندر استعمال کی جائیں تو اچھی ہیں اور اچھی بات وہ ہے جو انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو (فیمکث فی الارض ما ینفع الناس) جو انسانیت کو اس کے بلند تر مدارج طے کرنے میں مدد دے۔ جو زندگی میں زیادہ سے زیادہ استقامت، معاشرے میں زیادہ سے زیادہ توازن اور حسن پیدا کرے، ناہمواریاں دور کر کے ہمواریاں پیدا کرے۔

اسے معاینہ کرنا ہو تو ذرا اِدھر نظر ڈالیں تو یہ فیصلہ کرنے میں کسی قسم کا تذبذب نہ رہے گا، شراب اور دوسرے نشے چاہے کہیں بھی کسی حالت میں بھی کھلے بندوں یا چھپ کر استعمال کئے جائیں، جوا اور قماربازی کسی تکئے یا بیٹھک میں ہو یا ریس کے میدان میں، ہر حالت میں برائی رہینگے ــــــ کیوں؟ تفصیل میں گئے بغیر مختصراً یوں کہوں گا کہ یہ باتیں انسانیات کے لئے منفعت بخش نہیں۔ انسانیت تو کجا یہ تو ایک فرد کے لئے بھی باعثِ اطمینان نہیں، جوئے میں جیتنے والا بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ اپنے داؤ اور زیادہ عیارانہ بنا کر اور زیادہ سمیٹنے کی فکر میں رہتا ہے اور یوں اپنے ضمیر کو خراب اور اپنے نظامِ عصبی کو تناؤ میں مبتلا کرتا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ہر منفی سوچ منفی نتائج ہی پیدا کر سکتی ہے۔ جوئے میں جیتنے والے یا دوسروں کے حقوق اور احساسات کی پرواہ کئے بغیر اندھی دولت جمع کرنے والے کی مثال تو دوزخیوں کی سی ہے کہ وہ ہر چیز پیٹ میں ڈالتے چلے جاتے ہیں مگر پیٹ ہیں کہ بھرنے ہی میں نہیں آتے۔

نشے کے ذکر سے میرا ذہن اپنی قومی اور سماجی زندگی کے اس المیے کی طرف منتقل ہو گیا ہے جس کا عنوان ہمارے ہاں نشہ آور دوائیوں کا استعمال ہے۔ شراب سے قطعِ نظر افیون اور اس کے (ALKALOID) مارفیا (PETHIDIN) اور باربٹیوریٹ گروپ سیکونال سوڈیم وغیرہ کا بے دریغ استعمال ہے۔

اسی آپ کے شہر میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں مارفیا کے ٹیکوں کا کام ہوتا ہے ان کو استعمال کرنے والے کہیں کہیں کوئی کوالیفائڈ پڑھا لکھا ڈاکٹر بھی ہوگا مگر اکثر، بلکہ بیشتر کویک (QUACK) عطائی قسم کے لوگ ہیں جو اسے محض ایک کاروبار سمجھ کر اختیار کئے ہوئے ہیں۔

ایک بار میں ایک صاحب کے ہمراہ ایک بظاہر سوڈا واٹر فیکٹری میں داخل ہوا۔ کمرے میں سوڈا بھرنے کی ایک مشین نصب تھی مگر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ میرے بیٹھے بیٹھے کئی لوگ آئے اور چلے گئے مگر ان میں سے سوڈا کسی نے بھی نہیں خریدا۔ میرے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سوڈا تو کبھی کبھی ہی کام آتا ہے اور ٹیکہ کا کاروبار دن رات جاری رہتا ہے۔ کوئی ایک گولی، کوئی دو اور ایک دو کیا چھ چھ گولیاں مارفیا بیک وقت لینے والے سو رہا بھی دن میں کئی آتے ہیں ــــــ دن میں بیسیوں لوگ اس لعنت کے گرفتار آتے ہیں اور اپنے دامن میں یہ آگ سمیٹ کر اپنا خرمنِ حیات پھونکنے کو لے جاتے ہیں۔

شہر میں کتنے ایسے اڈے ہیں، یہ بتانا میرا کام نہیں مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ تھوڑے نہیں۔

ایک کیمسٹ کے ہاں بیٹھا تھا کہ ایک تانگے والا آیا، جیب سے ریزگاری نکال کر اس کے سامنے رکھ دی نہ اس کے پاس نسخہ تھا نہ اس نے منہ سے کچھ کہا۔ کیمسٹ نے ایک الماری میں سے ایک بوتل نکالی اور کچھ کیپسول اس کو دے دیئے۔ اسی طرح ایک اور دن ایک اور کیمسٹ کے ہاں میں نے دیکھا کہ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی آیا، اسی طرح ریزگاری میز پر ڈھیر کرتے ہوئے اس نے کہا "ایک بوتل" اور لفافے میں بند ایک بوتل لے

کر چلا گیا

"سالا میٹھا منائے گا اور آخر اندھا ہوگا"

یہ آدمی سپرٹ ایتھرس یا ٹنکچر زنجبیل کا خریدار تھا۔

"اندھا آخر کو کیا ہوگا اندھا تو یہ ابھی ہے۔" میں نے کہا: "ہاں اگر تمہارا مطلب آخرت کے اندھے سے ہے تو بھی ٹھیک ہے کہ اللہ میاں نے کہا ہے کہ یہاں کا اندھا وہاں بھی اندھا اُٹھایا جائے گا۔ مگر تمہارا اپنے متعلق کیا خیال ہے کہ تم جان بوجھ کر اسے یہ زہر دے رہے ہو۔"

"سب چلتا ہے میں نہ دوں تو کسی اور سے لے جائیگا اور یہ جو ڈھیر سی بوتلیں بنا کر بھیجتی ہیں۔ کمپنیاں۔ جو کمپنیاں اپنا سارا کوٹا اسی رستے نکال دیتی ہیں۔ کوئی سٹینڈرڈ چیز تیار نہیں کرتیں"

یہ بات میں نے ایک بار ایک معتدر وزیر صاحب سے کہی کہ حضور قوم نشے میں مست ہوتی جاتی ہے، کچھ کیجئے، کہیں ایسا نہ ہو ادھر کشمیر پہ جہاد کا بگل بجے اور قوم مارفیا گھوا کر یا سیکونال سوڈیم کھا کر خواب دیکھ رہی ہو تو وہ مہر بلب رہے۔ غالباً اُنہیں اس سے زیادہ اہم کام درپیش تھے۔

یہ نشے کی لت میرے خیال میں خاصا اہم مسئلہ ہے جس کی طرف ہمیں ضرور توجہ دینی چاہیے۔ کیونکہ یہ قوم کی صحت اور بیداری ہی پر نہیں قوم کے ضمیر پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے ——— کہیں ایسا نہ ہو کہ "گران خواب چینی تو سنبھل گئے" اور ہم نشے کا یہ میٹھا زہر پی کر "شہید" بن بیٹھیں۔

پہلے ہی ہمارے کرم فرما ہمیں روز زہر پلاتے ہیں اور ہماری ساری نسل بس کنیا کی طرح اس زہر پہ پروان چڑھ رہی ہے ——— ہاں آخر یہ ملاوٹیں جو ہم روزانہ خوراک میں استعمال کرتے ہیں زہر سے کیا کم ہیں؟ آٹا، چینی، ہلدی، مرچ، دودھ، گھی، نمک، چائے کون سی چیز ہے جو ہمیں خالص ملتی ہے۔ آخر نیم یا کیکر کے پتوں کی چائے، جوہڑوں کے پانی والا دودھ پلا کر ہم کسی سے کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ اور نمک بھی خالص نہ رہا کہ حق نمک تو لازم آتا۔ اور وہ بات شاید کسی نے لطیفہ کہہ کر آپ کو سنائی ہو مگر کتنی تلخ حقیقت ہے۔ اور ایسا جانگداز المیہ ہے کہ جب ضمیر کی آواز سے تنگ آ کر ایک ملاوٹ کرنے والے نے خود کشی کی نیت سے زہر کھائی تو وہ مر نہ سکا۔ کہ زہر ملاوٹ والی تھی۔

زہریلی خوراک کھا کر بیمار پڑنے والوں کو دوا درکار ہوتی ہے تو کئی بار اس پر بھی شک گزرتا ہے کہ یار لوگوں نے دوا ہی میں کچھ گڑ بڑ نہ کر دیا ہو۔ اور مریض تیماردار کے کانپتے ہاتھ سے دوا لیتے ہوئے سوچتا ہے۔

فانی دوائے درد کہیں زہر تو نہیں
کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا

اگر آپ حالات سے باخبر ہیں تو میری بات کو مبالغہ آرائی نہ سمجھیں گے۔ یہ باتیں تو پریس میں بھی آچکی ہیں کہ سلفا ڈائزین کے نام سے بکنے والی گولیاں چاک کی گولیاں نکلیں۔ اسٹریپٹومائسین کی شیشیوں کے اندر کچھ اور سفوف ملا ——— اور پھر کیا ہوا اس کے متعلق، کسی کو علم نہیں۔ اخبارات کو تو صفحے پُر کرنے ہوتے ہیں۔ یا اشاعت بڑھانے کی خاطر سنسنی خیز حکایتیں کہنی ہوتی ہیں۔ ان اخباروں میں ہم نے یہ تو پڑھا کہ چیکوسلواکیہ کی ایک نرس کو موت کی سزا ملی جس نے ایک مریض کی ایک لائف سیونگ دوائی کی شیشی خورد برد کرلی تھی مگر ہم نے یہ کبھی نہیں پڑھا کہ ہمارے ہاں کسی کو ملاوٹ کے جرم میں کوڑے لگائے گئے۔

ہم ان سزاؤں کو وحشیانہ کہہ کر اپنے مہذب ہونے کا سرٹیفکیٹ چاہتے ہیں۔ مگر میں اس پر رفیق العقلی کے سرٹیفکیٹ کی سفارش تو کرسکتا ہوں، تہذیب کی سند کی نہیں ——— تہذیب یافتہ ہونے کی سند حاصل کرنے کے لئے تو شاید آپ نے بناسپتی ملک کے کھانے اکٹھے ہوکر کھانے کی رسم اپنالی ہے۔

اپنی رفیق العقلی ملاحظہ ہو کہ سڑک کے کنارے کوئی گندے گلے سڑے پھل لئے بیٹھا بیچ رہا ہے مکھیاں ان کے گلے ہوئے حصّے کو چھپانے کی کوشش میں ان کے ساتھ چمٹی ہوئی ہیں ——— کوئی اسے منع کرتا ہے۔ اس کا سودا گراتا ہے۔ ضائع کرتا ہے تو آپ کے جذبات اُبل پڑتے ہیں۔ آنکھیں نم آلود ہوجاتی ہیں ——— بیچارے غریب کی روزی!

اگر امیر کو ہمارے ہاں عام لوگوں کی کھال نوچنے یا اس کے سر پر سوار ہونے کا حق ملا معلوم ہوتا ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ غریب کو بھی دوسروں کو بیمار کرنے کا حق دے دیا جائے؟ ——— شاید یہ بھی انسان کے بنیادی حقوق میں شامل ہے کہ اس بات کی اجازت دے دی جائے کہ وہ دوائی کی جگہ چاک کی گولیاں بیچیں، فارمولے کے مطابق دوا تیار نہ کریں اور اس طرح سے زیادہ سے زیادہ منافع کماسکیں تاکہ دولت مندوں کی لسٹ میں شامل ہوکر اپنا اور اپنی اولاد کا مستقبل روشن کرسکیں کیونکہ ہر سہولت حتیٰ کہ علاج اور تعلیم کی سہولت بھی اسی دولت سے خریدی جاسکتی ہے ورنہ چیف کالج میں ادیبوں، پروفیسروں اور ڈاکٹروں کے بچوں کی تعداد زمینداروں، کارخانہ داروں اور تاجروں کی اولاد کے برابر تو ہوتی۔

یہاں تو شاید وہ ایک بظاہر بہتر زندگی کا سامان کرلیں مگر آخرت میں ان کے لئے خسارہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی قوم کو، قوم شعیب، کے حشر کا سزاوار بنائے جاتے ہیں۔ کسی چیز میں ملاوٹ، کم تولنے کی دوسری شکل ہی تو ہے۔

ہمارے معاشرے نے یہ سب روا رکھا ہے آخر کیوں؟ "یو این او" کی کوئی کمیٹی ایسی باتوں کا کھوج بھی ضرور لگاتی ہوگی کیونکہ وہاں ہر قوم کا نمائندہ ہے اس کے پیشِ نظر سب اقوام کے مسائل ہیں۔ مگر وہاں شاید قوموں کی

اہمیت کے پیشِ نظر ہمارے جیسی پسماندہ اقوام کے مسائل کی ابھی باری نہیں آئی۔

بطورِ ایک معالج کے میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب علامات ہیں، بیماری نہیں۔ اور ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم علامات کے علاج پر زور دے رہے ہیں۔ اگر بخار صرف جسم کے گرم ہو جانے کا نام ہوتا تو مریض کو برف میں رکھ دینے سے اس کا علاج ضرور ہو جاتا۔ جسم پر نکلے ہوئے ایک ایک آبلے کو کاٹ کر مرہم لگانے سے جسم سے زہر دور نہ ہو جائیگا

اصل عارضہ یہ ہے کہ ہماری زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا، سوائے اپنی خواہشات کے حصول کے۔ نوعِ انسان کا نفع، انسانیت کے بڑھتے ہوئے کارواں کا فائدہ، اپنے اردگرد توازن اور حسن پیدا کر سکنے اور اطمینان اور امن کی فضا پیدا کرنے میں ممد ہونے کی خوشی حاصل کرسکنا ہمارے پیشِ نظر نہیں رہا ۔۔۔۔ یا اس خوشی کو اب ہم پہچان نہیں سکتے کہ یہ خوشی لطیف تر ہے اور ہم جسم کی لذتوں سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔

یہ حالت افراد کی بھی ہے اور اقوام کی بھی۔ عالمگیر سطح پر قومیں صرف اپنا نفع نقصان سوچتی ہیں، انسانیت کا نہیں۔ بنی نوعِ انسان کا نہیں۔ جمعیت اقوام بھی اقوام کی جمعیت ہے، جمعیتِ آدم نہیں۔ وہ بھی قوموں کی حدبندیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ان کے مفادات کی آویزشوں میں اُلجھی ہوئی ہے۔

اور قوموں میں بھی ان کی اہمیت کا اندازہ ان کے مسائل کی شدت سے نہیں بلکہ ان کے جاہ و جلال سے لگاتی ہے۔ اور انسانوں کی مشکلات کا حل قوموں ٹکڑوں میں بٹتا نہیں۔ رنگ، نسل سب کی تقسیم میں نہیں۔ ان سے علی الرغم، ان سے بلند ہو کر بنی نوعِ انسان کی بہتری سوچنے میں ہے۔

لاہور میں درسِ قرآن

ہر اتوار کی صبح ۔۔۔ ۹½ بجے - پرویز صاحب کے مکان واقعہ B-25 گلبرگ میں نہایت تزک و اہتمام سے ہوتا ہے۔ خواتین کے لئے پردہ کا عمدہ انتظام ہے

بزمِ طلوعِ اسلام۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حسن عباس رضوی ایم۔ اے
(طلوعِ اسلام کنونشن کی تقریر)

تحریکِ طلوعِ اسلام کا پس منظر

اگر آپ تاریخِ انسانی پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑائیں تو آپ کو آغازِ آفرینش سے لے کر آج تک دُنیا میں لاتعداد تحریکیں صف بستہ کھڑی نظر آئیں گی۔ ہر تحریک کا کوئی نہ کوئی مُنتہائے مقصود ہوتا ہے۔ خواہ وُہ مُنتہائے مقصود کتنا ہی مُختلف ہو اور اُس کے حصُول کے لئے کتنے ہی مُختلف ذرائع استعمال کئے گئے ہوں مگر اس تمام تگ و دو میں ایک بات آپ کو مشترک نظر آئے گی اور وُہ ہے "حصُولِ اقتدار"۔ یہ ایک فطری تقاضا ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پوری کی پوری انسانیت جنگِ اقتدار کی ایک خُونچکاں داستان ہے۔ ذرا اور بلند سطح سے دیکھیں تو انسانیت دو کیمپوں میں بٹی ہوئی نظر آئے گی۔ ایک وحیِ خُداوندی کی روشنی سے ہمکنار اور دُوسری اُس سے محروم۔ جو اقوام وحیِ خداوندی پر ایمان نہیں رکھتیں خُدا، کتاب، انبیاء اور آخرت کسی کو بھی در خورِ اعتناء نہیں سمجھتیں۔ اُن کے پیشِ نظر صرف مُفادِ عاجلہ ہوتا ہے اور اُن کا نظریۂ حیات صرف اِسی دُنیا تک محدُود ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وحیِ خُداوندی سے ہمکنار اقوام زندگی کا جو تصور پیشِ نظر رکھتی ہیں اُس کی رُو سے دُنیاوی زندگی اور اُخروی زندگی ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہوتی ہیں۔ لیکن جن اقوام نے وحیِ خُداوندی کو اپنایا ایک مُدت گزر جانے کے بعد اُنہوں نے بھی اس نظریۂ حیات کے ساتھ ظُلم کیا۔ اُنہوں نے اس دُنیا کی زندگی کو قابلِ نفرت سمجھا اور حیات بعد الممات ہی کو اصل زندگی قرار دے لیا۔ اُن کا کہنا ہے کہ "یہ کوئی ضرُوری نہیں کہ جس کی اُخروی زندگی تابناک ہو اُس کی دُنیاوی زندگی بھی خوشگوار ہو۔ بلکہ اس کے برعکس دُنیاوی زندگی جس قدر مُفلسی

اور بیکسی میں گزرتی ہے اُخروی زندگی اُسی قدر سنورتی ہے۔ مفلسی اور بے چارگی کی زندگی تو قربِ خداوندی کی نشانی ہے۔ مفلس و بے چارہ لوگ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں۔ جس کے کپڑے پھٹے پرانے ہونگے اور اُن میں جوئیں رینگ رہی ہوں گی اُسے آخرت کی زندگی میں کمخواب، اطلس اور زربفت کے ملبوسات ملیں گے جن میں لعل و یاقوت ٹکے ہوئے ہونگے"۔ آپ دیکھ رہے ہیں زندگی کس طرح دو حصّوں میں تقسیم ہو کر اجتماعِ ضدین بن گئی۔ حالانکہ برادرانِ عزیز! زندگی کے متعلق وحیٔ خداوندی کا اعلان یہ تھا کہ زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے دنیا (حال) کی زندگی کو آخرت (مستقبل) کی زندگی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اُس کی وسعتوں کو محدود کیا جا سکتا ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

طبعی موت سے جسم فنا ہو جاتا ہے مگر انسان کی ذات فنا نہیں ہوتی وہ تو مزید ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

وحیٔ خداوندی نے جہاں مادی نظریات کے علماء کو یہ انقلاب انگیز پیغام دیا ہے کہ دنیاوی زندگی کے بعد بھی زندگی کا وجود باقی رہتا ہے اور اُسے مستقبل یا آخرت کی زندگی کہا جاتا ہے، وہاں اُس نے مذہبی پیشواؤں کو بھی جھنجھوڑ کر خبردار کیا ہے کہ تم دنیاوی زندگی کو اُخروی زندگی سے جدا نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں اور ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ یہ نظریہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے کہ جس کی دنیاوی زندگی ناکام ہے اُس کی اُخروی زندگی کامیاب و کامران ہے خالقِ کائنات تو انسان کو دونوں زندگیوں کی خوشگواریوں اور دشواریوں کی نوید جانفزا دیتا ہے یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ زندگی دو حالتوں میں دو متضاد کیفیتیں رکھتی ہو۔ اُس کا کہنا ہے۔

مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى ۱۷/۷۲

جو اس دنیا میں اندھا (ناکام) ہے وہ اُخروی زندگی میں بھی اندھا (ناکام) ہے

اس کے برعکس

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۱۶/۳۰

جو لوگ نیک اعمال کرتے ہیں اُن کی یہ دنیا بھی حسین (کامیاب) ہوتی ہے اور اُن کی آخرت میں بھی کامیابی اور بہتری نصیب ہوتی ہے اس انقلابی دعوت کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے وحیٔ خداوندی یعنی قرآن حکیم نے اقوامِ عالم کو وہ مستقل اقدار عطا کیے جنہوں نے دنیائے انسانیت کا زاویۂ نگاہ بدل کر

رکھ دیا۔ خود ساختہ نظام ہائے حیات کے تمام اغلال و سلاسل تارِ عنکبوت کی طرح ٹوٹ کر رہ گئے۔ اس انقلاب آفریں پیغام کی اوّلین مخاطب قوم نے جونہی ان اقدار کو اپنایا دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم سلطنت کی مالک بن گئی۔ اُن کے ہاتھوں قیصر و کسریٰ کے قصر ہائے تہذیب کے فلک بوس مینار پیوندِ خاک ہو گئے اور عدلِ عمرانی کا آفتاب طلوع ہو گیا۔ اُس کی ضوفشانیاں لحظہ بہ لحظہ بڑھتی چلی گئیں۔ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔ تا آنکہ وہ تاریک دور جس میں قرآن حکیم کا نزول ہوا قرآنی اقدار کی تابکار قوتوں سے بقعۂ نور بن گیا۔ وہ قوم جو جاہلِ مطلق مشہور تھی کچھ اس طرح ایک عظیم انقلاب کا باعث بنی کہ تاریخ آج تک محوِ حیرت ہے کہ یہ سب کچھ کس طرح ہو گیا۔

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی

جیسا کہ آپ پہلے دیکھ چکے ہیں جتنی بھی تحریکیں اٹھیں اُن کا مطمحِ نگاہ حصولِ اقتدار تھا۔ اور یہ ہے بھی حقیقت۔ اقتدار کے بغیر کوئی تحریک بھی اُس نظام کو نافذ نہیں کر سکتی جس کی وہ داعی ہوتی ہے۔ لیکن اقتدار اور اقتدار میں بڑا فرق ہوتا ہے وحی کو الگ رکھ کر جو نظام قائم کیا جائیگا اس میں اقتدار کے معنی ہوں گے بعض انسانوں کا دوسرے انسانوں پر اقتدار۔ لیکن جو نظام وحی کے تابع ہوگا اس میں اقتدار کے معنی ہوں گے خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کو دنیا میں نافذ کرنے کی قوت تاکہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اپنے اقتدار کے تابع نہ کر سکے۔ جب وہ تحریک جو قرآن حکیم کے اوّلین مخاطبین نے چلائی تھی کامیاب ہوئی۔ تو اس نے ایک مرکز قائم کیا۔ اس مرکز نے قرآن حکیم کے عطا فرمودہ نظامِ حیات کو محسوس شکل میں قائم کر دیا۔ اس تحریک کے اوّلین سربراہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ حضورؐ کے بعد یہ سلسلہ آپؐ کے رُفقاء نے خلافت کی صورت میں آگے بڑھایا۔ لیکن یہ مسلمانوں کی ہی نہیں تمام عالمِ انسانیت کی بدقسمتی تھی کہ کچھ دیر بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور ستم بالائے ستم، یہ کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس حاملِ قرآن اُمّت کے ذہن میں اُس نظام کے خدوخال دھندلے پڑتے چلے گئے۔ تاریخ نے اُس دورِ ہمایوں کے واقعات کو یا تو گوشۂ فراموشی میں ڈال دیا اور یا پھر اس رنگ میں پیش کیا کہ آنیوالی نسلیں دین سے فرار کرنے لگیں۔ رہا قرآن حکیم یعنی وہ ضابطۂ حیات جسے اپنا کر ایک قوم بامِ ثریا پر جا پہنچی تھی اُسے تختِ جہانگیری سے اٹھا کر جزدانوں میں بند کر کے مسجدوں اور گھروں کی چار دیواری میں محبوس کر دیا گیا۔ وہ کتابِ عظیم جسے خدا کا کلام اور نبی آخر الزماں کا پیغام کہا جاتا تھا اور جس کے تسلط و جبروت کا یہ عالم تھا کہ

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

اُس کے الفاظ تو قائم رہے لیکن معانی بدل دیئے گئے۔ الفاظ اس لئے قائم رہے کہ ان کی تلاوت کو ہی جزوِ ایمان اور ملّت کا اجتماعی فریضہ سمجھ لیا گیا۔ اور معانی اس لئے بدل دیئے گئے کہ ان پر عمل ذاتی معاملہ قرار دیا گیا۔ جہاں تک قرأت کا تعلق ہے اُس پر اتفاق (اگر اُسے اتفاق کہا جا سکتا ہے) ہو گیا لیکن جہاں اُس پر عمل کرنے کا مسئلہ آیا۔ اُسے افراد کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔ اس دو عملی نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ جب مسلمان اس طرح عمل سے فارغ

ہو گیا تو اہلبیت نے سر اُٹھایا۔ وہی اہلبیت جو قرنِ مُبین کے آجانے پر رُخصت ہوئی۔ جنگلوں اور غاروں میں جا چھپی تھی کہیں شاہی درباروں میں عشوہ طراز ہوئی کہیں جُبّہ و عمامہ میں جلوہ افروز ہوئی اور کہیں مقدس مقامات میں نمودار ہوئی یہاں تک کہ پوری آب و تاب کے ساتھ منظرِ عام پر آگئی۔ وہی دیرینہ اسباق سامری ایک ایک کر کے سامنے آتے چلے گئے اور اپنے مخصوص سحر کارانہ انداز سے معاشرتی نظام میں پیوست ہوتے چلے گئے۔ اس طرح ہوائے شیطنت ڈگمگاتی ہوئی کشتیوں کو ڈبوتی رہی۔ قومِ طاغوت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رموزِ جہانبانی کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا اور خیر الامم آسودہ ساحل ہو کر دل کو تسلیاں دیتی رہی کہ یہ میری نہیں کسی اور کی کہانی ہے۔ وہ قیامت کے مسائل حل کرتی رہی لیکن اُسے یہ قیامت دکھائی نہ دی کہ

گرفتہ چینیاں احرام و مکّی خفتہ در بطحا

اور ایک وقت ایسا آیا کہ اُس کی سطوت و جبروت کی صرف کہانیاں باقی رہ گئیں۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ ۲۴/۱۹

ان کے اس انجام پر نہ آسمان رویا نہ زمین اور نہ ہی اُنہیں مہلت دی گئی

وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۲۳/۲۴

اور تاریخ کے صفحات پر اُن کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں

اس کے بعد مسلمان تذبذب اور بددلی کے عالم میں مارا مارا پھرتا رہا۔ زمین اُس پر اتنی تنگ ہو گئی کہ اسکے لئے ایک حسبہ سانس کے لئے بھی ٹھکانا نہیں تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر کوئی بھیڑ بکری کی طرح اُسے جس طرف چاہتا ہنکالے جاتا اس محرومی اور ناکامی کی حالت میں مسلمان در بدر خاک بسر پھر رہا تھا۔ ندرتِ فکر اور جدتِ کردار جیسی متاع بے بہا اس سے چھن چکی تھی اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اور کدھر جائے۔ اُسے اس گردابِ بلا سے نکالنے والا کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو ـــــ ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے

آخکار صدائے فیض کی گرم گستری سے اُنہی میں سے ایک مردِ راہ داں پیدا ہوا جسے اہلِ فکر پرویز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کہا جائیگا کہ پرویز بھی ایک مفکر ہے اور دوسری تحریکوں کے سربراہ بھی مفکر ہیں آخر اس میں کیا خاص بات ہے وہ خاص بات یہ ہے کہ پرویز کی فکر قرآن حکیم کے خاص چشمہ نور سے منوّر و مستنیر ہے۔

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

محترم پرویز صاحب نے جو فکر پیش کی ہے وہ منفرد کیفیت کی حامل ہے۔ اس کا ادنیٰ ثبوت اہلِ جُبّہ و عمامہ کی غوغا آرائی

سے ملتا ہے۔ والد مرحوم سے کسی نے پوچھا "عالم دین" کسے کہتے ہیں اُنہوں نے فرمایا میرے نزدیک عالم دین وہ مسلمان ہے جس پر مولوی صاحبان کفر کا فتوےٰ لگا دیں۔

دماغ میں فکر بلند کے علاوہ اللہ تعالےٰ نے پرویز صاحب کے سینے میں قلب حساس بھی رکھا ہے۔ یہی وہ قلب حساس ہے جس نے ملت کی محرومی کی الم ناک داستان اور مسلسل ناکامی کی وجہ سے اُن کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ اُنہوں نے سب سے پہلے اُس مرض کی تشخیص کی جو ملت کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا اور پھر اُس کا علاج تجویز کیا۔ اس مرد دُور بین کی نگاہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ ملت کا مرض قرآن کی رفاقت سے محرومی ہے اُس کا دین مذہب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اُس کا مرکز چھن گیا ہے۔ وُہ شجر ممنوعہ کی طرح ایک سو ایک شاخوں میں بٹ چکا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور عبادت کا مفہوم بدل گیا ہے مذہبی پیشوائیت، ملوکیت اور سرمایہ دارانہ ذہنیت پیدا ہو چکی ہے۔ جب مرض کی علت اور علامات معلوم ہو گئیں تو علاج بھی سامنے نظر آنے لگا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ نہ یہ مرض نیا ہے نہ اس کے لئے کسی نئے علاج کی ضرورت ہے۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

محترم پرویز صاحب نے دُکھتی ہوئی رگ پر اُنگلی رکھ دی اور لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ بیماری قرآن سے دُوری کی ہے اور علاج تمسک بالقرآن۔

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم — حکمت او لایزال است و قدیم
حرف او را ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
برخور از قرآن اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

اُنہوں نے قرآن خداوندی پر فکر کی اور فکر کا نچوڑ ہمارے سامنے رکھ دیا اللہ تعالےٰ نے صاف کہہ دیا تھا۔

لَن يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا
ایسا ہو نہیں سکتا کہ کافر مومنوں پر غالب آ جائیں
کیونکہ یہ خدا کا قانون نہیں بلکہ اس کے برعکس اُس کا قانون یہ ہے کہ
اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۳/۱۳۹
اگر تم مومن ہو تو تم ہی سب پر غالب رہو گے

نیز یہ کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ۔

اللہ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں گے اور تعمیری کام کریں گے وہ انہیں خلافتِ ارضی عطا کریگا

كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔ ۲۴/۵۵

" بالکل اسی طرح جیسے اس سے پہلے بھی سعادتمند ہستیاں اس انعام سے بہرہ یاب ہو چکی ہیں

یہ کہہ کر مزید تاکید کے لئے فرمایا کہ تم دیکھو گے کہ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۱۳/۳۱

اللہ تعالےٰ ہرگز وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

محترم پرویز صاحب اس فکر میں سرگرداں اور سوچ میں غلطاں و پیچاں رہے کہ اُن کے سینے میں بقائے انسانیت کا جو راز پوشیدہ ہے وہ کس طرح ظاہر کریں۔ کس طرح قرآن کی رفاقت سے محروم اور رسم و تکنیک کی تاریکیوں میں گم ملّت بیضا کو شمعِ قرآنی سے منوّر اور توازن بدوش راہ پر لا کھڑا کریں۔ اُن کے دل سے ہر دم یہ دُعا نکلتی ۔ یا رالٰہا

محرم تماشا کو پھر دیدہ بینا دے!

دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

برادرانِ عزیز! ضابطۂ حیات یعنی قرآن تو موجود تھا مگر نظامِ اسلامی کی اہم کڑی جس کے بغیر تمسک بالقرآن کا عمل (PROCESS) تکمیل نہیں پا سکتا موجود نہیں تھی۔ یہ اہم کڑی قوتِ نافذہ یعنی مرکزِ ملّت تھی ۔۔۔۔ قوتِ نافذہ نہ ہو تو قانون نافذ نہیں ہو سکتا اور قانون نافذ نہ ہو تو مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ لیکن قانون اور قوتِ نافذہ کے ساتھ ایک ایسے خطۂ ارض کی بھی ضرورت ہوتی ہے جہاں یہ قانون نافذ کیا جا سکے یہ وہ ضرورت تھی جس کا احساس علامہ اقبالؒ کو ایک مدت پہلے ہو چکا تھا چنانچہ اُنہوں نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مسلم لیگ کے اجلاس میں اس کے لئے نظریہ پاکستان کا تصور پیش کر دیا تھا اس پروگرام کی تکمیل کے لئے اقبال کی جوہر شناس نگاہ نے قائداعظم محمد علی جناح علیہ الرحمۃ کا انتخاب کر لیا تھا۔ نظریہ پاکستان کی مخالفت میں ہندوؤں کے علاوہ نیشنلسٹ مسلمان اور علماء بھی میدان میں آ پہنچے تھے۔ اس وقت ایک ایسے مفکرِ قرآن کی ضرورت تھی جو ان نیشنلسٹ علماء کو قرآن کی روشنی میں مسکت جواب دے سکے۔ فطرت کی طرف سے یہ فریضہ پرویز صاحب کے سپرد ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں قائداعظم نے شاعرِ مشرق کے حسین خواب کی تعبیر پیش کرنے کے لئے پاکستان کی تحریک چلائی اور اس تحریک کی ہمنوائی میں پرویز صاحب نے ماہنامہ طلوعِ اسلام کے اجراء کے ساتھ تحریک طلوعِ اسلام کا آغاز کیا۔ عزیزان گرامی وہ کتنا مبارک اور حسین منظر تھا جب یہ دونوں تحریکیں دینِ خداوندی کے غلبہ کی خاطر ہم منزل

کی طرف گامزن ہوئیں۔ ان حالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو تحریکِ پاکستان کے اصل محرک حضرت علامہ اقبالؒ، حضرت قائدِ اعظمؒ اور محترم پرویز صاحب ہیں۔ طلوعِ اسلام کا پہلا دَور قیامِ پاکستان پر منتج ہوا۔

دُوسرا دَور پہلے سے کہیں زیادہ اہم اور سعی و کاوش کا متقاضی تھا۔ کیونکہ خطۂ زمین تو مل گیا تھا لیکن اُس قانون کا نفاذ ہنوز باقی تھا جس کی خاطر پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ اصل میں قانونِ خداوندی کا نفاذ اور غلبہ ہی ایسی چیزیں تھیں جنہوں نے پرویز صاحب کو علامہ اقبالؒ کی رہنمائی کے مُطابق حضرت قائدِ اعظمؒ کے ساتھ اشتراک پر آمادہ کیا تھا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں کہ طلوعِ اسلام کو نہ تو مذہبی فرقہ بننا مقصود تھا اور نہ سیاسی جماعت بننا منظور تھا۔

طلوعِ اسلام کے سامنے نہ کوئی ذاتی مفاد تھا نہ ہوسِ اقتدار۔ اُس کے پیشِ نظر اسلامی نظام کا نفاذ تھا جس کے ذریعے اقتدار کو خدا اور خدا کے قانون کے لئے مخصوص کیا جا سکے۔ کیونکہ اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکشی کا مرجع خدا اور صرف خدا کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن بارہ سو برس کے طویل عرصہ میں قرآن سے لاتعلقی نے مسلمان کو قرآن سے بالکل بیگانہ کر دیا تھا۔ اس دَور میں ایسے مسلم علماء بھی گزرے جنہوں نے یہاں تک فتوے دے دیا کہ اسلام ایک تجربہ تھا جو ناکام رہا اب اُسے دُہرایا نہیں جا سکتا۔ گویا بارہ سو سال کی محرومی نے اُس سے بھی بدتر حالت کر دی جو بعثت نبویؐ سے پہلے تھی۔ پاکستان بننے کے ساتھ ہی۔ جیسا کہ ہوا کرتا ہے ایسی جماعتیں بھی پاکستان میں آ گئیں جن کا کام غول راہ بن کر اولادِ آدم کو بھٹکاتا تھا۔ اُنہی دنوں میں یعنی پاکستان بننے کے صرف ایک سال بعد قائدِ اعظمؒ بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ اور اس نوزائیدہ پودہ کو ابتداء ہی میں بادِ سموم کی مہلک آندھیوں سے سابقہ پڑ گیا۔ یعنی یکے بعد دیگرے ایسی حکومتیں بنتی رہیں جن کے بنانے والوں کے پیشِ نظر ذاتی مفاد اور اقرباپروری کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ایسے وقت میں طلوعِ اسلام کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ عوام کو قرآن کے رموز و اسرار سے روشناس کرانے کے کام کو زیادہ سے زیادہ تیز کر دے۔ اس مقصد کے تحت پاکستان میں اور پاکستان کے باہر غیر ممالک میں طلوعِ اسلام کی بزمیں قائم کی گئیں۔ تاکہ اُن کی وساطت سے طلوعِ اسلام کی پیش کردہ فکر کو عام کیا جائے۔ علاوہ ازیں پرویز صاحب کی شبانہ روز محنت کی بدولت دُنیا کو ایسا لٹریچر مِل رہا ہے جس کی وہ بارہ سو سال سے منتظر چلی آ رہی تھی۔ اس لٹریچر نے قرآن پر جو صدیوں سے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے ایک ایک کر کے نوچ پھینکے۔ سلسلۂ معارف القرآن، لغات القرآن، مفہوم القرآن، سلیم کے نام خطوط اور وقتاً فوقتاً اشاعت پذیر ہوتے رہنے والی کتب اور پمفلٹوں نے قوم کے جسدِ مردہ میں نئی روح پھونک دی۔ جس نے اس لٹریچر کو بغور دیکھا قرآنی حقائق کو سمجھنے میں اُس کی دقتیں ختم ہوتی چلی گئیں۔ مذہبی پیشوائیت جو پیرِ تسمہ پا کی طرح انسانیت کو جکڑے ہوئے تھی اس کے بل ڈھیلے پڑ گئے۔

ندرتِ فکر اور جدتِ کردار سے مذہبی پیشوائیت نے جس خود ضبط کر رکھا تھا عوام کو واپس ملنے لگی اور مسلمان ایک بار پھر تفکر و تدبر کی کشادہ شاہراہ پر بھی سے گامزن ہو گیا۔ یہ قرآن حکیم کا اعجاز تھا اور پرویز صاحب کا دوسرا

دل جو حقائق کو پاکر چپ نہ رہ سکا۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتابِ آخر

قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔

تمہارے اعمال آپ اپنا نتیجہ بن جاتے ہیں۔

یعنی اعمال ہی نتائج میں منتقل (CONVERT) ہو جاتے ہیں۔ گویا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو بے نتیجہ رہے وہ اچھا ہو یا بُرا اُس کا نتیجہ برآمد ہو کر رہتا ہے اور نتیجہ بھی عمل کے مطابق یعنی اچھے عمل کا اچھا نتیجہ اور بُرے عمل کا بُرا نتیجہ عمل تو کیا ذہن کے عمیق ترین گوشوں میں پیدا ہونے والا خیال بھی نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہماری نمازیں، روزے، حج، اور زکوٰۃ بے اثر ہو کر رہ گئے ہیں ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا یعنی یہ سب فریضے تو ادا ہو رہے ہیں لیکن مسلمان پھر بھی محتاج کا محتاج ہی ہے، دنیا میں کہیں مسلمانوں کی کوئی پائیدار حکومت نہیں ہے بلکہ وہ سب اقوام مغرب کے رحم و کرم پر زندہ ہیں۔ اصل موضوع سے ہٹ کر اس کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی رہی اور عیب بات نہیں تو کہہ دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا خوشگوار زندگی کا وعدہ تو حیاتِ اُخروی سے متعلق ہے۔ اس دُنیا کی زندگی تو محض کھیل تماشہ ہے جوں توں کر کے گزارہ کرلو جنت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ مگر برادران عزیز! طلوعِ اسلام نے ان فراری ذہنوں کو جھنجوڑ کر کہا کہ یہ غلط ہے۔ قرآن کا وعدہ ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ۲۴/۵۵

"اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائینگے اور نیک کام کرینگے وہ انہیں خلافت ارضی عطا کر دے گا۔"

اور اس کے برعکس

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا ۔

اور جس نے قانونِ خداوندی سے اعراض برتا اُس کی معیشت اس دُنیا میں تنگ کر دی جائے گی۔

وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۲۰/۱۲۴

اور قیامت کے دن اُسے اندھا یعنی ناکام و نامراد اُٹھایا جائے گا۔

گویا جس کی یہ زندگی خوشگوار ہے اُس کی بعد کی زندگی بھی خوشگوار ہے۔ اور جس کی یہ دُنیا ناکامیوں اور نامرادیوں سے پُر ہے اُس کی اُخروی زندگی بھی مجموعہ نامرادی و ناکامی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ہمارے اعمال کے نتائج اس دُنیا میں مرتب ہو کر رہتے ہیں کوئی عمل بغیر نتیجہ کے نہیں رہتا۔ ہمارے نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کے وہ نتائج

مرتب ہونا چاہئیں تھے جن کے لئے اِن کو فرض کیا گیا تھا۔ لیکن اگر یہ سب فریضے ادا ہو رہے ہیں اور مطلوبہ نتائج مرتب نہیں ہوتے تو سمجھ لیجئے کہ یہ نتائج ہمارے صحیح اعمال کے نہیں ہیں۔ یہ اعمال جو ہم بزعمِ خویش صحیح ادا کر رہے ہیں وُہ اصل میں غلط ہیں۔ طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ جب حالت یہ ہو تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہمارے اعمال کے وُہ نتائج کیوں برآمد نہیں ہو رہے جو اِن کا لازمی حِصلہ تھے۔ کہیں یہ فرائض ہی تو غلط طریق پر ادا نہیں ہو رہے۔ اگر یہ سمجھ میں آجائے کہ کہیں فروگذاشت ہو رہی ہے تو اِن کو قرآن کے مطابق کر لو۔ وہی غلبہ و اقتدار وہی فردوسِ گم گشتہ پھر حاصل ہو جائیگا۔ طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ اِن فرائض کی صحیح صورت اُس وقت پیدا ہوگی جب خالصتاً قرآنی نظام قائم ہو جائے گا۔ کیونکہ قرآن ہی وہ ضابطہ حیات ہے جس کے ذریعے انسان اِس دُنیا میں بھی خوشگوار زندگی حاصل کر سکتا ہے اور آخرت کی زندگی بھی سنوار سکتا ہے۔ یہ قرآن ہی تو ہے جس کے متعلق ایک عیسائی مفکر فرانسیسی جرنیل نپولین بونا پارٹ نے کہا تھا۔

"مجھے اُمید ہے وُہ دن دور نہیں جب میں تمام ملکوں کے دانشمند اور تعلیم یافتہ لوگوں کو اکٹھا کروں گا اور ایک ایسی حکومت بناؤں گا جو قرآن کے اصُولوں پر مبنی ہوگی اس لئے کہ صرف قرآن ہی انسان کی فلاح و بہبُود کا راستہ بتاتا ہے۔"

قانُون ہمارے پاس موجُود ہے لیکن یہ قانُون اُس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک اُس قانون کے پیچھے قوّتِ نافذہ نہ ہو۔

ہے اساسِ ملّتِ اسلام آئین و امیر — صورتِ ملّت کہاں جب ہوں نہ یہ دونوں بہم
بے امیر آئین جاری ہو نہیں سکتا کہیں — اور بے آئین آمر پیکرِ جور و ستم

اور ہم دیکھتے ہیں کہ

اصل آئین آج بھی حق آن میں محفوظ ہے — جانشینِ مصطفےٰ سے ہیں مگر محروم ہم
جس پہ ملّت کے نظامِ زندگی کا ہے مدار — پیکرِ ملّت میں ہے گویا وہی اک چیز کم

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ اطاعتِ قوانینِ خداوندی اور اطاعتِ رسولؐ یہی ہے کہ لوگوں کو قرآن مجید کے صحیح مقام سے روشناس کرایا جائے۔ اور سُنّتِ نبویؐ کی پیروی کرتے ہوئے اُس مرکزِ ملّت اور اُس معاشرے کی تشکیل کے لئے فضا سازگار بنائی جائے جس کے بغیر تکمیلِ دین ممکن ہی نہیں۔

اُن کی سُنّت اک جماعت اُنکی سُنّت اک امیر — اُنکی سُنّت اک حکومت اُنکی سُنّت اک حکم
جب تک اِس سُنّت کی پوری پیروی ہوتی نہیں — دیکھ سکتے ہی نہیں ہیں صورتِ اسلام ہم

اس اجتماعی کوشش کا نام طلوعِ اسلام ہے۔ آج ہم چند ہم سفر و ہم رکابِ طلوعِ اسلام کنونشن کی شکل میں یہاں موجود ہیں اور اُس عہد کی تجدید کی خاطر جمع ہوئے ہیں جو ہم نے آج سے ۱۲، ۱۳ برس قبل منتخب راہ ایک منزل کے فاصلے پر مقام حاصل

میں ایک ببول کے درخت کے نیچے سالارِ کاروانِ حریت کے مقدس ہاتھوں پر اپنے مالکِ حقیقی سے باندھا تھا۔ جس عہد کو توڑ کر خاسر و نامراد مسلمان مارا مارا پھر رہا ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جو قوم اپنے مرکزِ ملت کو کھو دیتی ہے اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کی خاطر طرزِ وفا بھول جاتی ہے اُس سے ہر وہ رعایت چھن جاتی ہے جس کا تعلق ایفائے عہد سے ہوتا ہے۔

برادرانِ عزیز! جس مرکزِ ملت کو ہم نے کھو دیا ہے ہمیں اُسی کی تلاش ہے۔ اُسی فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کی تمنا ہے جو شرف و مجدِ انسانی کا صحیح مسکن ہے اُسی عہدِ شکستہ کی تجدید و تکمیل کی تڑپ ہے جو ہمیں کشاں کشاں یہاں لے آئی ہے لیکن برادرانِ عزیز! ایک بات سے آگاہ رہیئے کہ مسلمان کو غیر مسلم کبھی بھی زیر نہیں کر سکا اگر مسلمان کو کبھی نقصان پہنچا ہے تو صادق و جعفر سے پہنچا ہے۔ صادق و جعفر ہر معاشرے اور ہر جماعت میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور پیدا ہوتے رہینگے۔ ممکن ہے ہم میں بھی ہوں ان سے ہوشیار رہیئے۔ جس چیز کو آپ نے اپنایا ہے صدقِ دل سے اُس پر قائم رہیئے اللہ کے فضل و کرم سے کامیابی آپکے قدم چومیں گی

اس دور میں سب مٹ جائینگے ہاں باقی وہ رہ جائیگا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

تحریکِ طلوعِ اسلام خدا اور رسول کی امانت ہے جسے محترم پرویز صاحب نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ تحریک کیا ہے؟ اصل میں شمعِ قرآنی ہے جسے پرویز صاحب نے ہماری رہنمائی کے لئے تھام رکھا ہے۔ آپکو دیکھ کر دل سے یہ دعا نکلتی ہے۔

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری اُمیدوں کا
جگر کا خون دے دیکر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

اے شمعِ قرآنی کے پروانو! خبردار اس امانت میں خیانت نہ ہونے پائے اگر یہ شمع بجھ گئی تو آپ کا کچھ بھی نہ رہیگا۔ اگر آپ اس کی حفاظت نہ کر سکے تو آپ کی حالت بھی اُس بڑھیا سے مختلف نہ ہوگی۔

كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا (۱۶/۹۲)

" جو تمام دن بمشقت سوت کاتتی رہے اور شام کو خود ہی اپنے ہاتھوں تار تار کرکے بکھیر دے۔ "

آپ کی ہم عصر تحریکیں اور موجودہ دور کے حاملینِ نظریاتِ حیات بڑے غور سے آپ کی تحریک کے ارتقائی اقدام کا مطالعہ کر رہے ہیں اُن میں بہت سے آپکے دشمن ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اس تحریک کو مسرت بھری اُمیدوں کے ساتھ پھلتے پھولتے دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ کیونکہ آپ نے اُنہیں فردوسِ گم گشتہ کا نشان دکھا دیا ہے آپ کا فرض ہے

کہ آپ اُن کی رہنمائی کرتے ہوئے منزل کی طرف لے جائیں۔ اَلسّٰبِقُوْنَ الاَوَّلُوْنَ ۔ بننا مشکل ہوتا ہے کھیتیاں سینچ کر حاصل دوسروں کیلئے چھوڑ دینا صبر آزما ہوتا ہے، اپنا خون دیگر دوسروں کے لئے زندگی کی خوشگواریاں مہیا کرنا عقل و خرد سے آگے بڑھ کر عشق و جنوں میں قدم رکھنا ہے جو بادی النظر میں ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن آپ کو یہی کچھ کرنا ہے۔ خدا نہ کرے، خدا نہ کرے اگر اس صراطِ مستقیم پر آپ کے قدم ڈگمگا گئے تو نہ صرف آپ گریں گے بلکہ آپ کے ساتھ وہ تمنائیں بھی موت کی نیند سو جائیں گی جنہیں آپ نے اور صرف آپ نے عوام کے دلوں میں بیدار کیا تھا۔ ایسی صورت میں

> انسانیت زندگی کے چوراہے پر آپ کا دامن تھام لے گی اور آپ سے اس جائز سوال کا جواب چاہے گی کہ وہ فردوسِ گم گشتہ کہاں ہے جس کی اُمیدیں دلا کر تم مجھے یہاں تک لے آئے ہو۔ جب تمہیں خود اس نظام پر یقین نہ تھا تو پھر مجھے کیوں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرتے رہے۔

تھی اگر مے سے صراحی تیری خالی ساقی
تو چراغ درِ میخانہ جلایا کیوں تھا

حسن عباس رضوی۔ ایم۔ اے

۸-۱۱-۶۴

السابقون الاوّلون

سیلیکٹ کمیٹی